آوازِ دوست

خواجہ شمس الدین عظیمی

مکتبہ روحانی ڈائجسٹ

۱ ڈی ۱/۲ ناظم آباد کراچی ۱۸

عظیمی پبلشرز

ناظم آباد ۱ ، کراچی ۱۸

فون: ۶۱۶۴۳۳

قیمت - ۳۵ روپے

فہرست

انتساب

اُن روشن ضمیر "دوستوں" کے نام جنہوں نے میری "آواز" پر رُوحانی مشن کے لئے خود کو وقف کر دیا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

اللہ کے دوستوں کی پہچان یہ ہے کہ انہیں دین اور دنیا کی زندگی میں خوف اور غم نہیں ہوتا

مذہب اور ہماری نسل

حضرت عمرؓ کی خدمت میں جب کہ وہ دربارِ خلافت میں تشریف فرما تھے ایک عورت اپنے بچے کو لے کر آئی اور اس نے کہا۔

"امیر المؤمنین! میرا بیٹا گڑ زیادہ کھاتا ہے۔ گھر میں گڑ نہیں ہوتا تو ضد کرتا ہے اور مجھے بہت زیادہ پریشانی اُٹھانی پڑتی ہے۔"

امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے چند ساعت غور فرمایا اور کہا۔ "اپنے بیٹے کو ایک ہفتے کے بعد لے کر آنا۔"

خاتون ایک ہفتے کے بعد پھر آئی۔ حضرت عمرؓ نے بچے کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "بیٹے گڑ کم کھایا کرو اور ضد نہ کیا کرو۔ تمہارے اس عمل سے تمہاری ماں پریشان ہوتی ہے" اور بچے کی ماں سے کہا۔ "اس کو لے جاؤ، اب یہ پریشان نہیں کرے گا۔"

حاضرینِ مجلس نے عرض کیا۔

"امیر المؤمنین! اتنی سی بات کہنے کے لئے آپ نے اس عورت کو ایک ہفتے تک انتظار کی زحمت دی۔ یہ بات آپ پہلے روز بھی فرما سکتے تھے۔"

حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا۔ "میں خود گڑ زیادہ کھاتا تھا۔ میں نے گڑ کھانا کم سے کم کر دیا۔ اور ایک ہفتے تک اس ترک پر عمل کر کے اس عادت کو پختہ کر لیا۔ پہلے ہی روز اگر میں بچے سے یہ کہتا کہ تم گڑ کم کھایا کرو تو اس کے اوپر میری نصیحت کا اثر نہ ہوتا۔ اب

اس کے اوپر اثر ہوگا اور وہ عمل کرے گا۔"

بے یقینی، درماندگی، پریشانی اور عدم تحفظ کے اس دَور میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص اپنے چھوٹوں اور اپنے احباب کو بُرائی سے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور خود اس پر عمل نہیں کرتا تو ہمارے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ نصیحت کا اثر اس لئے نہیں ہوتا کہ ہم خود بے عمل ہیں۔

ہر طرف یہ شور وغوغا برپا ہے کہ موجودہ نسل اسلام سے دور ہوگئی ہے، اسلاف کی پیروی نہیں کرتی۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ موجودہ نسل کے اسلاف میں ہمارا بھی شمار ہے۔

موجودہ نسل اگر تعلیماتِ رسولِ مقبولؐ سے دُور ہوگئی ہے تو اس میں اس کا قصور کم اور ہمارا زیادہ ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ جھوٹ بولنا بُری بات ہے۔ ناجائز منافع خوری، چور بازاری اللہ کے بندوں کی حق تلفی ہے مگر جھوٹ ہماری زندگی میں کامیابی اور کامرانی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ قرآن کی متعین کردہ حدود سے زیادہ منافع خوری نے ایک سائنس کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ بچے جب یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے والدین زبان سے اللہ اور اس کے رسُولؐ کی تعلیمات کا پرچار کرتے ہیں اور ان کا عمل اس کے بالکل برعکس ہے تو اُن کے ترقی یافتہ ذہن میں بجز اس کے کوئی بات نہیں آتی کہ مذہب صرف اظہار و بیان کا نام ہے۔ عمل سے اس کا کوئی ربط ضبط نہیں۔

دنیا میں افراتفری کا ایک عالم برپا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی اُلجھن میں گرفتار ہے۔ ذہنی سکون ختم ہوگیا ہے۔ عدم تحفظ کے احساس سے حُزن وملال کے سائے گہرے اور دبیز ہوگئے ہیں۔ اخبارات میں آئے دن حادثات اور انسانوں کی قیمتی جانیں ضائع ہونے کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی فلک بوس عمارتوں کے سرنگوں ہونے اور اُن کے

نیچے بندگانِ خدا کے ہلاک ہونے کی دلدوز اور وحشت اثر خبریں ہمارے سامنے آتی ہیں اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ ہم آفات ارضی وسماوی کی یلغار کی زد میں ہیں۔ بظاہر ان المناک واقعات کے وقوع پذیر ہونے کی ہم یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ تعمیر کنندگان کی ہوسِ زر کی وجہ سے یہ نوبت آئی ہے یا زمین کے اندر ردّ وبدل اس کا سبب ہے۔ یہ باتیں بظاہر کتنی ہی معقول اور وزنی ہوں لیکن اگر ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے دیکھا جائے تو فرمانِ خداوندی کے بموجب انسانی معاشرہ میں آباد لوگوں کے جرائم اور خطا کاریاں ارضی وسماوی آفات اور ہلاکتوں کو دعوت دیتی ہیں۔

جب کوئی قوم قانونِ خداوندی سے انحراف وگریز کرتی ہے اور خیر وشر کی تفریق کو نظر انداز کرکے قانون شکنی کا ارتکاب کرنے لگتی ہے تو افراد کے یقین کی قوتوں میں اضمحلال شروع ہوجاتا ہے۔ آخر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یقین کی قوت بالکل معدوم ہوجاتی ہے اور عقائد میں شک اور وسواس در آتے ہیں۔ اس تشکیک اور بے یقینی کی بنا پر قوم توہمات میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ توہماتی قوتوں کے غلبے سے انسان کے اندر طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے پیدا ہونے لگتے ہیں جس کا منطقی نتیجہ حرص وہوس پر منتج ہوتا ہے۔ یہ حرص وہوس انسان کو اس مقام پر لے جاتی ہے جہاں بے یقینی اور توہماتی قوتیں مکمل طور پر اس کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان زندگی کی حقیقی مسرتوں سے محروم ہوجاتا ہے اور اس کی حیات کا محور اللہ تعالیٰ کی بجائے ظاہری اور مادی وسائل بن جاتے ہیں اور جب کسی قوم کا انحصار در وبست مادی وسائل پر ہوجاتا ہے تو آفاتِ ارضی وسماوی کا لامتناہی سلسلہ عمل میں آنے لگتا ہے اور بالآخر ایسی قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ شک اور بے یقینی کو دماغ میں جگہ دینے سے منع فرماتے ہیں۔ یہ وہی شک اور وسوسہ ہے جس سے آدمؑ کو باز رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بالآخر شیطان نے بہکا کر آدمؑ کو شک اور بے یقینی میں گرفتارِ بلا کر دیا جس کے سبب آدمؑ کو جنّت کی نعمتوں سے محروم ہونا پڑا۔

●●●

آتش بازی

آیئے! آج کی نشست میں اپنا محاسبہ کریں اور یہ دیکھیں کہ ہمیں اطمینانِ قلب کیوں نصیب نہیں ہے۔ اور عدمِ تحفّظ کا احساس ہمارے اوپر کیوں مسلط ہے۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر شخص خیالات میں غلطاں و پیچاں، اِرد گرد سے بے نیاز چہروں پر غم و آلام کی تصویریں سجائے اپنی دنیا میں مگن ہے تو دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ بھی پریشان ہے جس کے پاس سب کچھ ہے اور وہ بھی دل گرفتہ ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ بیماریوں، پریشانیوں، خود نمائی اور احساسِ کمتری کے دبیز سایوں نے ہمیں اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ غرض جتنے لوگ ہیں ان کے اتنے ہی مسائل ہیں مگر ایک بات سب میں مشترک ہے کہ سکون کسی کو حاصل نہیں ہے۔ سب کے ماتھوں پر بے اطمینانی، عدمِ تحفظ اور محرومی کی شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ سب شکست خوردہ اور نفرت و حقارت کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ دولت کی ہوس اور معیارِ زندگی بلند سے بلند ہونے کے تقاضوں نے اولادِ آدم کے لئے دنیا کو دوزخ بنا دیا ہے۔ اقوامِ عالم میں اقتدار کی ہوس رکھنے والوں نے انسانی فلاح و بہبود کے نام پر اربوں کھربوں روپے آسمانی آتش بازی میں تباہ کر دیئے۔ جب کہ نوعِ انسانی کی بڑی آبادی بھوک و افلاس کا شکار ہے۔

آج یہ منفی سوچ اتنی زیادہ عام کیوں ہے کہ آدمی ان چیزوں سے خوش نہیں ہوتا

جو اُسے حاصل ہیں۔ ان خواہشات کے پیچھے کیوں سرگرداں ہے جن کے حصول میں وہ
اعتدال کی زندگی سے روگردانی پر مجبور ہے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ ہم صبر و استغنا
کی نعمت سے محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ صابر و شاکر اور مستغنی نہیں ہیں وہ اللہ سے دُور ہو جاتے ہیں
اللہ سے دُوری سکون و عافیت اور اطمینانِ قلوب سے محرومی ہے۔ یہ محرومی صبر و استغنا
کی لذت سے ناآشنا کر دیتی ہے۔ صبر و استغنا وہ تلوار ہے جس سے ہم مسائل و مشکلات
اور عدم تحفظ کی زنجیریں کاٹ کر پھینک سکتے ہیں۔ جب کسی فرد کو صبر و استغنا کی دولت
مل جاتی ہے تو اس پر سے مصائب و مشکلات کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے۔ اور جب
من حیث القوم صبر و استغنا کسی قوم کے مزاج میں رچ بس جاتا ہے تو معاشرہ سدھر
جاتا ہے۔ قومیں حقیقی فلاح و بہبود کے راستوں پر گامزن ہو جاتی ہیں۔

یاد رکھیئے ! سکونِ دل اور خوشی کوئی خارجی شے نہیں ہے۔ یہ ایک اندرونی
کیفیت ہے۔ جب اس اندرونی کیفیت سے ہم وقوف حاصل کر لیتے ہیں تو ہمارے
اوپر اطمینان و سکون کی بارش برسنے لگتی ہے۔ بندہ اس ہمہ گیر طرزِ فکر سے آشنا ہو کر
مصیبتوں، پریشانیوں اور عذاب ناک زندگی سے رستگاری حاصل کر کے اس حقیقی
مسرت و شادمانی سے واقف ہو جاتا ہے جو اس طرزِ فکر کے حامل بندوں کا حق اور
ورثہ ہے۔

آسمانی صحائف اور تمام الہامی کتابوں سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ
نے یہ کائنات محبت کے ساتھ پیدا کی ہے۔ تخلیقِ کائنات کے فارمولوں پر تفکر کیا جائے

تو زندگی کا ہر شعبہ محبت اور خلوص کا پیکر نظر آتا ہے۔ انسان جس کے لئے یہ ساری
کائنات بنائی گئی اس کی ساری زندگی ازل تا ابد دو رُخ پر قائم ہے۔ ایک رُخ وہ
ہے جو انسان کو خالقِ کائنات سے قریب کرتا ہے اور دوسرا رُخ وہ ہے جو بندہ کو
اپنے خالق سے دُور کر دیتا ہے۔

حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں چھپا ہوا خزانہ تھا پس میں
نے محبت کے ساتھ مخلوق کو پیدا کیا تاکہ میں پہچانا جاؤں۔ یہ بات محلِ نظر ہے کہ اللہ تعالیٰ
فرماتے ہیں کہ میں نے محبت کے ساتھ تخلیق کیا یعنی اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کا واحد ذریعہ محبت
ہے اور اللہ تعالیٰ سے دُور کرنے والا جذبہ محبت کے خلاف نفرت ہے۔ قرآن پاک
کی تعلیمات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی نوعِ انسانی کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ انبیاءِ
کرام کا مشن یہ رہا ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق کی ذہنی تربیت اس نہج پر کریں کہ ان کے اندر آپس
میں بھائی چارہ ہو، ایثار ہو، خلوص ہو اور وہ ایک دوسرے سے محبت کریں۔

جس معاشرے میں محبت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے وہ معاشرہ ہمیشہ پُرسکون رہتا ہے
اور جس معاشرے میں بیگانگی اور نفرت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اس معاشرے کے افراد
ذہنی خلفشار اور عدمِ تحفظ کے احساس میں مبتلا رہتے ہیں۔

محبت سراپا اخلاص ہے۔ نفرت مجسّم غیظ و غضب اور انتقام کے خدوخال پر
مشتمل ہے۔ غصہ بھی نفرت کی ایک شکل ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے جو لوگ غصہ کو کھاتے
اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے احسان کرنے والے بندوں سے محبت کرتا
ہے۔ نفرت کا ایک پہلو تعصب بھی ہے۔ حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے جو شخص تعصب پر جیا اور
مرا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یعنی تعصب کرنے والا کوئی بندہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعت

سے محروم رہتا ہے۔

محبت کیوں کہ پرسکون زندگی اور اطمینانِ قلب کا ایک ذریعہ ہے، اس لئے کوئی انسان جس کے اندر محبت کی لطیف لہریں دَور کرتی ہیں وہ مصائب و مشکلات اور پیچیدہ بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے چہرے میں ایک خاص کشش پیدا ہو جاتی ہے اس کے برعکس نفرت کی کثیف، شدید اور گرم لہریں انسانی چہرہ کو جھلس دیتی ہیں بلکہ اس کے دماغ کو اتنا بوجھل، پریشان اور تاریک کر دیتی ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ودیعت کردہ زندگی میں کام آنے والی لہریں مسموم اور زہریلی ہو جاتی ہیں۔ اس زہر سے انسان طرح طرح کے مسائل اور قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

نفرت سے پیدا ہونے والے امراض کی اگر تفصیل بیان کی جائے تو وہ بہت ہی بھیانک ہے۔ نفرت سے پیدا ہونے والی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ انسان اپنے خالق سے دُور ہو جاتا ہے اور یہ دُوری اُسے اشرف المخلوقات کے دائرے سے نکال کر حیوانیت اور درندگی کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ نفرت انسانی چہرہ کو مسخ کر دیتی اور اس جذبۂ شیطنت سے آدمی کے اندر جو بیماریاں جنم لیتی ہیں وہ سرطان ہے، بھگندر اور پھوڑا ہے اور ایسے لاعلاج متعدد امراض ہیں جن میں گرفتار ہو کر آدمی سسک سسک کر مر جاتا ہے۔

●●●

ماں

یہ فقیر ہر ماہ کسی نہ کسی عنوان سے آپ سے مخاطب ہوتا ہے۔ آج کی نشست میں عامۃ المسلمین کی ذہنی پریشانی، عدمِ تحفظ کا احساس، خوف اور مستقبل کی طرف سے مایوسی کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اُداس، غمگین اور پژمردہ چہرے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایسے مسافر ہیں جن کی کوئی منزل نہیں ہے۔ جب کہ اسلامی زندگی کے دلکش خد و خال اختیار کر کے ہم اپنے اندر غیر معمولی کشش اور انتہائی جاذبیت پیدا کر سکتے ہیں۔ اہلِ اسلام ہی نہیں بلکہ دوسری قومیں بھی اسلامی اصولوں کی ضیا پاشیوں سے متاثر ہو کر دینِ مبین کی طرف کھنچنے لگتی ہیں اسلام یقیناً ہوا، پانی اور روشنی کی طرح سارے انسانوں کی عام میراث ہے۔ لیکن محض زبانی طور پر اس کا اقرار کر لینا کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے ایثار و عمل کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے۔

آج کے ترقی یافتہ دَور میں والدین اور بزرگوں کا احترام کم سے کم ہوتا جا رہا ہے اور یہ پہلا قدم ہے جہاں سے اسلامی اخلاقی قدروں میں شکست و ریخت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے حکم سے سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی امت کے لئے بالخصوص اور نوعِ انسانی کے لئے بالعموم ایسے روشن اور واضح اصول مرتب کئے ہیں جن پر عمل کر کے ہم ذہنی کشاکش، اعصابی کشمکش، الجھنوں اور پریشانیوں سے محفوظ و مامون ہو سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام گوشت تقسیم فرما رہے تھے کہ ایک عورت تشریف لائیں۔ حضورؐ نے کام چھوڑ کر اُن کے لئے اپنی چادر بچھائی اور معزز خاتون کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ اس چادر پر بٹھایا۔ حضرت ابوالطفیلؓ کہتے ہیں میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون برگزیدہ ہستی ہیں؟ وہاں موجود لوگوں نے بتایا یہ بزرگ عورت وہ ماں ہیں جنہوں نے آپؐ کو دُودھ پلایا ہے

والدین کے ساتھ حُسن سلوک کے سلسلے میں سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

"اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم خدا کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔"

محسن کی شکر گزاری اور احسان مندی شرافت کا اوّلین تقاضا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارے وجود کا محسوس سبب "ماں باپ" ہیں جن کی پرورش اور نگرانی میں ہم پلتے بڑھتے اور شعور کو پہنچتے ہیں اور جس غیر معمولی قربانی، بے مثال جانفشانی اور انتہائی شفقت و ایثار سے وہ اولاد کی دیکھ بھال اور تربیت کرتے ہیں، حق یہ ہے کہ ہمارا دل اُن کی عقیدت، احسان مندی اور عظمت و محبت سے سرشار ہو اور ہمارے جسم کا رُواں رُواں ان کا شکر گزار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی شکر گزاری کے ساتھ ساتھ والدین کی شکر گزاری کی تاکید فرمائی ہے۔

باپ کے دوستوں اور ماں کی سہیلیوں کے ساتھ بھی حُسن سلوک اور احترام کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کو قدر و منزلت اور وقعت کی نظر سے دیکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اللہ کے نبیؐ نے فرمایا ہے:

سب سے زیادہ نیک سلوک یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوست کے ساتھ بھلائی کرے۔

ہم ایک لباس بناتے ہیں۔ وہ سوتی کپڑے کا ہو، اُون کا ہو یا نائلون کے تاروں کا، مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم لباس کے ذریعے خود کو چھپائیں۔ اسی طرح رُوح نے خود کو پس پردہ رکھنے کے لئے ایک لباس اختراع کیا ہے اور یہ لباس گوشت پوست اور ہڈیوں سے مرکب ہمارا جسم ہے۔ جس طرح جسم کے بغیر لباس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور نہ ہی لباس کی اپنی کوئی ذاتی حرکت ہے۔ اسی طرح رُوح کے لباس کی اہمیت اسی وقت تک ہے جب تک رُوح اس لباس کو اہمیت دیتی ہے۔ ہم کوٹ یا شیروانی زیب تن کرتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوٹ ہمارے جسم پر ہو اور ہم ہاتھ ہلائیں اور آستین نہ ہلے۔ یہ بھی قرین قیاس نہیں ہے کہ کوٹ کو کھونٹی پر لٹکا دیا جائے یا چارپائی پر ڈال دیا جائے اور اس کے اندر اسی طرح حرکت پیدا ہو جس طرح جسم کے اوپر رہتے ہوئے ہوتی ہے ـــ لباس کی حیثیت اسی وقت تک ہے جب تک وہ جسم کے اُوپر ہے۔ گوشت پوست سے مرکب لباس (جسم) کی تمام حرکات و سکنات کا دارومدار اونی یا سوتی لباس کی طرح رُوح کے اوپر ہے۔ رُوح جب تک جسم میں موجود ہے، جسم چلتا پھرتا ہے اور اس میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ رُوح جب اس جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے تو جسم کی حیثیت کھونٹی پر لٹکے ہوئے کوٹ کی ہو جاتی ہے۔

کسی عاقل، بالغ، باشعور آدمی کو اگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے ماں باپ کون ہیں تو وہ کتنا ہی ذہین اور قابل کیوں نہ ہو اس کے اوپر ایک احساس محرومی مسلط رہتا ہے اور احساس محرومی انسانی زندگی میں اتنا بڑا خلاء ہے کہ بالآخر ایسا بندہ دماغی مریض بن جاتا

ہے۔ پاگل پن زیادہ ہو یا کم، بہر حال اس کا نام پاگل کے علاوہ کچھ نہیں رکھا جاتا۔

صورتِ حال یہ ہے کہ ہم اس بات سے تو وقوف رکھتے ہیں کہ ہمارا وجود ہے لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ہمارا پیدا کرنے والا کون ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہمیں پیدا کرنے والا اللہ ہے تو یہ ایسی ہی بات ہوگی کہ ہم گوشت پوست کے جسم کو اصل آدمی سمجھتے ہیں جب کہ اس آدمی کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ آدمی رُوح کے تابع ہے اور رُوح ہماری جسمانی آنکھوں سے چھپی ہوئی ہے۔ محض زبانی طور پر یہ کہہ دینا کہ ہمارا خالق اللہ ہے، اعترافِ خالقیت کا تقاضا پورا نہیں کرتا۔ وہ آدمی جس کو کچھ پتہ نہیں کہ اس کے ماں باپ کون ہیں یہ کہتا ہے کہ اُسے ماں باپ نے جنم دیا ہے۔ اگر ہم اپنی رُوح سے واقف نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور ربّانیت کا تذکرہ محض مفروضہ حواس پر مبنی ہوگا۔ کتنی ستم ظریفی ہے کہ معاشرے میں ایسے شخص کو کوئی مقام نہیں دیا جاتا جس کے ماں باپ کا کوئی پتہ نہ ہو اور ہم اللہ تعالیٰ کا زبانی تذکرہ کر کے خود کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں۔ اللہ وہ ہے جس کی سماعت سے ہم سنتے ہیں، جس کی بصارت سے ہم دیکھتے ہیں اور جس کے فواد سے ہم سوچتے ہیں اور اس بات کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ اس اللہ کی جو ہمیں پیدا کرتا ہے اپنے خاص کرم و فضل سے ہماری پرورش کرتا ہے، ہماری حفاظت کرتا ہے اس کو پہچاننے کی کوشش کریں جب کہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ "اور وہ لوگ جو ہمارے لئے جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کے اوپر ہدایت کے راستے کھول دیتے ہیں۔"

تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء اللہ کا یہی مشن ہے کہ بندہ جس طرح اپنے والدین سے وقوف رکھتا ہے اسی طرح اپنے خالق کا عرفان حاصل کرے۔

امتحان

پریشان حالی اور درماندگی نے ہشت پا بن کر نوعِ انسانی کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں نوعِ انسانی وہ مخلوق ہے جو اللہ تعالیٰ کی اُن نعمتوں کی حامل ہے جن کے متحمل ہونے سے سماوات، ارض اور جبال نے عاجزی کا اظہار کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق جب کوئی قوم صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتی ہے تو وہ امتحان کی چکی میں پسنے لگتی ہے تاکہ صعوبتوں، پریشانیوں اور عدم تحفظ کے زہریلے احساس سے محفوظ رہنے کے لئے وہ راستہ تلاش کرے جو فلاح اور سلامتی کا راستہ ہے۔

یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ یہاں ہر ایک کسی نہ کسی امتحان میں دانستہ یا نادانستہ مصروفِ عمل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آدمی امتحان میں کامیاب ہو کر اپنی زندگی کا کوئی رخ متعین کرے۔ کوئی دولت مند ہے، کوئی غریب نادار اور بیمار ہے اور کوئی ویسا بھی بدبخت ہے جس کے ذہن میں بزرگوں اور ماں باپ کی عزت و توقیر نہیں یہ سب باتیں امتحان کا درجہ رکھتی ہیں۔

کائنات کی تخلیق دو رخوں پر کی گئی ہے۔ ایک رخ سے دوسرا رخ ملا ہوا ہے اور ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں قدم رکھنا ایک امتحان ہے۔ آپ ذرا اس بچے کا تصور کیجیے جو کمرہ امتحان میں بیٹھ کر جب پرچہ سامنے آئے تو بجائے پرچہ حل کرنے

کے رونا شروع کر دے، فریاد کرنے لگے اور احتجاج کرے کہ میرا امتحان کیوں ہو رہا ہے۔

نشو و نما اور انسانیت کی فلاح و ترقی کندن ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ امتحان کی بھٹیوں سے گزر کر ہی سونا کندن بنتا ہے۔ نوعِ انسانی ان بھٹیوں سے نہ گزری ہوتی تو آج بھی لوگ غاروں کے مکین ہوتے۔

کوئی مسئلہ اس وقت تک قابلِ حل نہیں ہے جب تک صاحبِ مسئلہ خود اُس مسئلہ کو حل کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ ساری دعائیں، وظیفے اور دوائیں صرف ایک ہی کام انجام دیتی ہیں، وہ یہ کہ سائل بیمار ہو یا پریشان حال اس کے اندر قوتِ ارادی میں اضافہ ہو اور اس کے اندر اتنی دل پاور (خود اعتمادی) پیدا ہو جائے کہ وہ مسائل و معاملات کی بھول بھلیوں سے نکل کر ذہنی یکسوئی کے ساتھ آزاد ہو سکے۔

دنیا میں جتنے عظیم لوگ پیدا ہوئے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی مسئلہ سے دوچار رہے ہیں لیکن وہ اس نکتہ سے باخبر ہوتے ہیں کہ مسائل اس وقت تک مسائل ہیں جب تک انسان ذہنی یکسوئی اور سکون کی زندگی سے ناآشنا ہے۔ ان لوگوں کے اُوپر سے مسائل و تکالیف کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے جو اللہ کی مخلوق کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ کسی ایسے شخص کی خدمت کیجئے جو نادار ہے، ضرورت مند ہے۔ پھر دیکھئے کہ آپ کو کتنا سکون ملتا ہے۔ دوسروں کی مدد کرنا اور ان کے کام آنا انسانیت کی معراج ہے اور یہی وہ مشن ہے جس کو عام کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے ہیں جن کا پیغام ہے :

اللہ تعالےٰ نے انسان کو اپنا مثل بنایا ہے اور انسانیت کی خدمت اللہ کی خدمت ہے۔

هستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

زندگی کی چھان بین کرنے سے ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ آدمی کی تصویر مختلف النوع خیالات کے رنگوں سے مرکب ہے۔ خیال ہمیں مسرت آگیں زندگی سے قریب کرتا ہے۔ اور یہی خیال ہمیں غم ناک زندگی سے آشنا کر دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سائنس ترقی کے عروج پر پہنچ گئی ہے لیکن آج کے سائنس دان وہی کہہ رہے ہیں جو ہزاروں سال پہلے روحانیت کے علم بردار کہہ چکے ہیں اور جس کا پرچار آج بھی ان کے پیروکار حضرات مشن ہے ـــــ وہ یہ کہ مادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ زندگی کا قیام لہروں پر ہے اور لہریں خیالات کا جامہ پہن کر ہر شے کا وجود بن رہی ہیں۔ مادے سے بنی ہوئی تصویروں میں ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے وہ مفروضہ اور محض فریبِ نظر ہے۔

نوعِ انسان کے نجات دہندہ، محسنِ انسانیت حضور رحمۃ للعالمینؐ نے چودہ سو سال پہلے اس کی عقدہ کشائی اللہ کے کلام میں اس طرح فرمائی ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اللہ آسمانوں اور زمین کی روشنی (لہر) ہے۔

آدمی جو خود کو اشرف المخلوقات کہتا اور سمجھتا ہے، اگر اپنی ابتدا اور انتہا پر غور کرے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس تعمیر کی پہلی اینٹ سڑاند اور تعفن سے بنی ہے اور انتہا یہ ہے کہ اس کا خوبصورت جسم کیڑوں کی خوراک بن جاتا ہے۔ باوجود اس واضح اور کھلی حقیقت کے کتنے لوگ ہیں جو اپنی ابتدا اور انتہا پر غور کرتے ہیں؟ تخیل کی پرواز کا مطالعہ کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ہر شخص ذاتی منفعت کی خیالی دنیا میں مگن ہے۔ ایک ہی خیال اس کی طلب اور مقصدِ حیات بن گیا ہے ـ دولت ـ دولت ـ اور صرف دولت۔

وہ دولت جو بذاتہ ایک ایسی لا انتہا دلدل ہے جس میں گر کر کوئی آدمی اشرف ہو اس میں زندہ نہیں رہ سکا۔

جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر ڈالتے ایسے لوگ بالآخر دردناک عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ دولت کا حصول بُری بات نہیں ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہم نے سب کچھ دولت ہی کو سمجھ لیا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا زہر معاشرے کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم سکون کے ایک لمحہ کو بھی ترستے ہیں اور عدم تحفظ کا احساس ہمارے اوپر مسلط ہے۔ رشتوں کا تقدس پر دولت کی چھاپ لگ گئی ہے۔ ایک دوڑ ہے جو ہمیں ہوس پرستی کے خیالی گھوڑے پر آگ کی طرف دھکیل رہی ہے۔

ہر زمانے میں عقل مندوں نے ہوسِ زر کی مخالفت کی ہے۔ قرآن نے اسے حطمہ کہا ہے جس کی آگ ستون کی مانند دلوں پر چڑھ جاتی ہے اور آدمی کو بھسم کر ڈالتی ہے۔ جو دولت "حطمہ" نہیں ہے وہ روشن سورج، تاروں بھری رات، چاند کی ٹھنڈک، عطر بیز ہوائیں اور ایک پرسکون دل ہے جس میں طمع اور لالچ نہیں ہوتا، جو جھوٹ سے بچتا ہے، جس میں دوسروں کے کام آنے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے اور جو اللہ کی مخلوق کے لئے زندہ رہنے کی تمنا کرتا ہے۔ ایسے ہی صاحبِ دل لوگ ہیں جن کو اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے اور اُن کی تخلیقی سوچ اللہ کی سوچ ہوتی ہے۔ ان کی نظر میں سب اپنے ہوتے ہیں۔ انہیں سب میں اللہ کا نور نظر آتا ہے۔ اُن کی زندگی ایسے روشن اور پاکیزہ خیالات کا مرقع ہے جن میں کوئی کثافت نہیں ہوتی۔ لالچ اور گمراہی کے عقوبت خانوں کے دروازے ان کے اوپر بند ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں ایسی حلاوت ہوتی ہے جیسی حلاوت شیر خوار بچے کو ماں کی گود میں ملتی ہے۔

آپ ذرا لالچ اور طمع اور ہوسِ زر کی بندشوں کو توڑ کر تو دیکھئے، کتنا سکون ملتا ہے۔ دنیا کا کوئی آدمی بُرا نہیں ہوتا، خیالات اچھے یا بُرے ہوتے ہیں۔ آپ کے پاس اگر دولت ہے، اُسے اللہ کی راہ میں مسکین، زردلی اور کراہتی ہوئی انسانیت پر خرچ کیجئے۔ جو کچھ آپ کے پاس ہے اس پر شکر بجا لایئے۔ جو نہیں ہے اس پر کڑھئے نہیں۔ احساسِ کمتری سے خود کو دُور رکھیئے۔ قدر و منزلت، شرافت و نجابت کا معیار دولت نہیں، ہر آدمی کے پاکیزہ اور زندہ خیالات ہیں۔

●●●

بادشاہی

میں چاہتا ہوں کہ آپ کو وہ گُر بتا دوں جس سے اسفل آدمی اشرف المخلوقات بن کر اللہ تعالیٰ کی بادشاہی میں قدم رکھ دیتا ہے اور اس کی مداومت سے بالآخر وہ اللہ کی بادشاہی میں ایک رُکن کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا کام کرتے ہیں؟

اللہ بحیثیت خالق کے ہر وقت، ہر لمحہ اور ہر آن اپنی مخلوق کی خدمت کر رہا ہے۔ پیدائش سے موت تک کی زندگی کا احاطہ کیا جائے تو یہی نظر آتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں، پیدائش کے بعد ایامِ رضاعت (بچپن) میں، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ وہ تمام ضروریات اور وسائل فراہم کرتے ہیں جن کی آدمی کو ضرورت ہو۔ ہوا ہو، سورج کی روشنی ہو، چاند کی چاندنی ہو یا زمین کے اندر وسائل پیدا کرنے کی صلاحیت ہو، ایک مرکز اور ایک قانون کے تحت آدمی کی خدمت گزاری ان کی ذمّہ داری ہے۔ خدمت کا یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص نظام اور قانون کے تحت قائم و دائم ہے۔ ایسا قانون جو اللہ تعالیٰ نے خود بنایا ہے اور خود اس کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ جب ہم کسی سے قربت چاہتے ہیں تو اس کی عادات و اطوار اختیار کر لیتے ہیں۔ آپ کسی نمازی سے دوستی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے ساتھ نمازی بن جاتے ہیں۔ کسی تاش کھیلنے والے سے دوستی قائم کرنا چاہتے ہیں تو تاش کھیلنا شروع

کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم شیطان سے قربت کے خوگر ہیں تو شیطان کے اوصاف پسند کرتے ہیں اور اگر ہم رحمان سے قربت چاہتے ہیں تو رحمان کی عادات و صفات اختیار کرتے ہیں۔ اور رحمان کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی خدمت میں ہر وقت معروف ہے۔

پس، اگر آپ اللہ، اپنے خالق سے متعارف ہو کر، اس کی قربت اختیار کر کے کائنات پر اپنی حاکمیت قائم کرنا چاہتے ہیں تو اللہ کی مخلوق کی خدمت کو اپنا شعار بنا لیجئے۔ بلاشبہ اللہ کی مخلوق سے محبت رکھنے والے لوگ اللہ کے دوست ہیں اور دوست پر دوست کی نوازشات و اکرامات کی ہمیشہ بارش برستی ہے۔

ترجمہ: یہ بڑائی اللہ کی ہے، دیتا ہے جس کو چاہے، اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔

(القرآن)

آج تک نوعِ انسانی نے جو تہذیبی پیش رفت کی ہے اس کا ایک اہم پہلو تاریخ کے حوالے سے حال کی صورت گری اور مستقبل کی نشان دہی ہے۔ مروجہ تمام علوم کسی نہ کسی جہت سے انسان کے حال کو بہتر بنانے اور یقینی مستقبل کی ضمانت فراہم کرنے کی جدو جہد میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ کا علم سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

آج ہم جانتے ہیں کہ ہم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تہذیبیں اسی زمین پر ظاہر ہوئیں اور پھر اس طرح معدوم ہو گئیں کہ صرف آثار باقی رہ گئے۔ تباہ ہونے والی ان قوموں کا تذکرہ صرف زمانہ قبل از تاریخ پر کی جانے والی تحقیق میں ہی نہیں ملتا بلکہ نوعِ انسانی کی مربوط و مسلسل تاریخ ایسی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

جب ہم ان عوامل کا کھوج لگاتے ہیں جو ان قوموں کی مکمل تباہی میں کار فرما ہیں تو

ہمارے سامنے یہ بات کھل کر آجاتی ہے کہ جن قوموں کا رشتہ دنیا سے مستحکم اور اپنی روح سے کمزور ہو گیا بالآخر ان کے اوپر حرص و طمع اور لالچ غالب آگیا۔ ایسی قوموں کا مقصدِ زندگی صرف اور صرف دنیا کا حصول بن جاتا ہے اور کبھی نہ ختم ہونے والی حرص و ہوس کی دوڑ میں پورا معاشرہ اس طرح گرفتارِ بلا ہو جاتا ہے کہ کوئی صورت باہر نکلنے کی باقی نہیں رہ جاتی۔ شرافت و نجابت، تقویٰ و پاکیزگی کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے جس کے گھر میں مال و دولت کے انبار ہیں اور جس کے پاس آسائش و آرام کا ضروری اور غیر ضروری سامان موجود ہے وہ معاشرہ میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جب کہ اس بات سے ایک فردِ واحد بھی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ سب عارضی اور مفروضہ ہے اور آخر کار سب کچھ چھوڑ دینے پر ہر شخص مجبور ہے۔ کوئی چیز اس کے ساتھ نہیں جاتی اور جو چیز اس کے ساتھ جاتی ہے، جس سے وہ دوسری دنیا میں آرام و سکون حاصل کر سکتا ہے، اس سے وہ تہی دامن جاتا ہے۔ دنیا میں ایسے بندے کو جس کے پاس آخرت کے لئے کوئی اثاثہ نہیں ہوتا مصائب و آلام اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ زندگی دشوار ہو جاتی ہے۔ رنج و غم ہیبت ناک شکلیں اختیار کر کے اس کو مُردہ بدست زندہ بنا دیتے ہیں۔ جب یہ صورتِ حال انفرادی سطح سے بڑھ کر اجتماعی ہو جاتی ہے تو قومیں تباہ و برباد کر دی جاتی ہیں یا پھر ان کے چہرے مسخ ہو جاتے ہیں۔

دنیا کی محبت ان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ وہ موت جیسی حقیقی زندگی سے خوف زدہ رہنے لگتے ہیں۔ نفس پرستی، عیاشی، پراگندگی، فتنہ انگیزی، ظلم و ستم عام ہو جاتا ہے۔ دوسری قومیں طرح طرح کی سازشوں کے جال بچھا کر اور مال و زر کے لالچ میں مبتلا کر کے ان کم ہمت قوموں کے وجود کو ختم کر دیتی ہیں۔

اَمانت

دوستو ساتھیو!

ہم سب ایک دُوسرے کی دُعاؤں کے محتاج جس قدر آج ہیں، شاید اس سے پہلے احتیاج کی یہ صورت نہ رہی ہو۔ ہر گھر میں ہر فرد مضطرب اور بے چین ہے۔ کبھی آپ نے یہ سوچا بھی ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ جب اخلاقی اقدار ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں اور آدمی اپنی رُوح سے دُور ہو جاتا ہے تو اس کے اُوپر مادیت کا خول غالب آجاتا ہے۔ مادّہ کیا ہے؟ عناصر کا ایسا مجموعہ جس کی فطرت میں ہر آن اور ہر لمحہ تغیر پذیری ہے۔ کبھی آپ نے مادّہ کو ایک حال پر قائم دیکھا۔ مادّہ (MATTER) کی تخلیق کا منشا ہی یہ ہے کہ اس میں ردّ و بدل ہوتا رہے۔ جس چیز میں زیادہ ردّ و بدل ہوتا ہے وہ اتنی ہی زیادہ حقیقت سے دُور ہوتی ہے۔ حقیقت میں کبھی تغیّر نہیں ہوتا۔ وہ قائم بالذّات ہے۔ جو چیز قائم بالذّات ہے وہ نشیب و فراز اور حالات کے تغیر سے متاثر نہیں ہوتی۔ انسان کیا ہے، رُوح ہے۔ رُوح کیا ہے، رُوح اللہ کا امر ہے۔ اللہ کا امر کیا ہے، اللہ کا امر اللہ کا ارادہ ہے۔ اللہ کا ارادہ کیا ہے، اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو تخلیق کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے ہو اور وہ ہو جاتی ہے۔

ذرا بھی تفکّر سے کام لیا جائے تو یہ بات سُورج کی طرح روشن ہے کہ ہم بحیثیت مجموعی اور بحیثیت فرد رُوح ہیں۔ رُوح اللہ کا امر ہے۔ اللہ کا امر اللہ کا ارادہ ہے اور

اللہ کا ارادہ جب حرکت میں آجاتا ہے تو کائنات کے مظاہر چھپنے لگتے ہیں۔ اتنی تعداد میں چھپتے ہیں کہ دنیا کی شماریات عاجز ہیں۔

اب جب ہم اپنے ماحول، اپنے گھر کے ماحول، غم آشنا زندگی، صعوبت سے پُر حالات، پیچیدہ اور الم ناک خیالات، اُلجھے ہوئے اور ازکار رفتہ تصورات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے صرف اور صرف ایک ہی بات آتی ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کو مادی خول میں قید کرلیا ہے۔ رُوح سے اپنا رشتہ تقریباً منقطع کرچکے ہیں۔ کتنی بدنصیب ہے نوعِ انسان کہ سب کچھ پاس ہوتے ہوئے بھی مفلس و قلاش ہے، تہی دست اور تنگ ظرف ہے کہ آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اندھی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مادہ (MATTER) سے محض عارضی رشتہ ہے، اسی کو مقصدِ زندگی قرار دے لیا ہے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ وقت مقررہ کے بعد بہر حال بیک بینی و دوگوش اس دُنیا سے رخصت ہوجاتا ہے اور مادہ سے بنے ہوئے آسائش و آرام کے سارے سامان ہم سے جبراً اپنا رشتہ منقطع کرلیتے ہیں۔

اے آدم زاد! تیرے لئے قدرت اتنی کریم و رحیم ہے کہ اس نے ہر موڑ پر تیرے لئے معافی کے دروازے کھول دیئے اور تجھے اپنے دامنِ عافیت میں لینے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے —— اے کاش تو سوچتا کہ تو نے کیا کھویا ہے کیا پایا ہے۔

اے آدم و حوّا کی نافرمان اولاد! تو نافرمانی کے اس گندے تالاب میں غرق آب ہے جہاں دنیا اور دین کا خسارہ ہے۔ بلاشبہ یہ ایسا خسارہ ہے جو انسانی بدنصیبی کا مکروہ داغ ہے۔

دوستو ساتھیو!

آؤ، اپنی اس میراث کو تلاش کریں جس کے متحمل سمٰوٰت اور ارض اور پہاڑ بھی نہیں ہوسکے۔ وہ میراث جس کے سامنے آسمان، زمین، ستارے، شمس و قمر سب مسخر ہیں۔

یہ امانت 'مادہ کے خول سے ماورا' ہماری رُوح کے اندر موجود ہے۔

خود فراموشی

ہم کیا تھے، کیا ہیں اور کیوں ہیں ـ ؟

یہ ایسے سوالات ہیں جو ہر ذی فہم اور باشعور آدمی کے ذہن میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ اور جب اُن کا شافی وکافی جواب نہیں ملتا تو بہت سے لوگ گم کردہ راہ ہوجاتے ہیں۔ کچھ نہ سمجھنے کی پاداشں میں نہ صرف یہ کہ خود فراموشی اُن کے اُوپر مسلط ہوجاتی ہے، وہ اس ہستی کی بھی نفی کردیتے ہیں جو اس سارے کارخانے کی مشینوں کے ایک ایک پُرزے کو حیات (ENERGY) بخش رہی ہے۔ وہ لازوال ہستی جو ایک قطرہ خون کو اتنا طاقتور اور عقل وشعور سے آراستہ وپیراستہ کردیتی ہے کہ خلا اس کی گرفت میں آجاتا ہے، ستاروں پر کمند ڈالنا اس کے لئے کھیل بن جاتا ہے یہی قطرۂ خون جب چاہتا ہے تو ایک ناقابلِ تذکرہ ذرّہ کو اتنی اہمیت دے دیتا ہے کہ ایک ذرّے کی قیمت لاکھوں جیتے جاگتے آدمیوں سے زیادہ ہوجاتی ہے۔

اور جب تعمیری شعور بروئے کار آتا ہے تو یہی ایک قطرہ پھیل کر آسمانوں کی رفعت سے بھی اونچا اور سربلند بن جاتا ہے، کائنات اس کے لئے مسخّر ہوجاتی ہے اور یہ فرشتوں کا مسجودِ قرار پاتا ہے۔

تعمیر وتخریب کے اس دورُخ پہلو میں بھی ذرّہ بے مقدار اسفل میں گرتا ہے تو اخلاقیات کی تمام حدبندیاں ریزہ ریزہ ہوجاتی ہیں۔ حرص وہوس اور معیارِ زندگی کا

عفریت اس کی کمزوری بن جاتا ہے۔ ہر اس کام میں اس کا ذہن مرکوز ہوجاتا ہے جو اخلاقی دائرے سے باہر ہے۔ ایسی ایسی اختراعات وایجادات ذہن میں آتی ہیں جو ابلیسیت کا شاہکار ہوتی ہیں۔ اور دماغ کی تمام تعمیری صلاحیتیں تخریب کا لباس پہن کر اللہ کی زمین پر فساد برپا کردیتی ہیں۔

بلاشبہ آج کا دَور اس کا بیّن ثبوت ہے۔ کس قدر المناک ہے یہ بات کہ رمضان المبارک کے مہینے میں روزانہ ایسی خبریں سامنے آتی رہیں کہ لگتا ہے ہم معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے اور کچلے ہوئے افراد ہیں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاشرے کی زبوں حالی میں ہمارے نونہال ملوث ہیں تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور یہ آواز اُبھرتی ہے کہ یہ سب اس لئے ہورہا ہے کہ ہم نے اپنی تعلیمات سے منہ موڑ لیا ہے۔ ہم نہیں سوچتے کہ وہ کون سی تعلیم ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد انسان کو سکون ملتا ہے، راحت ملتی ہے اور سرشاری اس کے انگ انگ میں جذب ہوجاتی ہے۔

وہ کون سی زندگی ہے جس کے حامل کو عدم تحفظ کا احساس نہیں ہوتا اور وہ احساسِ کمتری کے بھیانک تاثرات سے محفوظ ومامون رہتا ہے۔ اس کے اوپر کسی قسم کا خوف نہیں ہوتا اور نہ وہ خود کو غم وآلام کی دبیز چادر میں لپٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔

پریشانی یہ ہے، موجودہ نسل اتنی باشعور ہوچکی ہے کہ اس کے لئے کوئی بات اس وقت قابلِ قبول ہے جب اُسے فطرت کے مطابق پیش کیا جائے۔ سائنس کی ترقی نے انسانی شعور کو بڑی حد تک بالغ کردیا ہے۔ ہماری نسل کے بالغ اور باشعور افراد

جب اپنے اسلاف کے ورثہ، علم کو فطری قوانین اور سائنسی توجیہات کے مطابق سمجھنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا ہے کہ مذہب چوں چرا نہیں چاہتا حالانکہ قرآنِ کریم ہر ہر قدم پر تفکر کی کھلی دعوت دے رہا ہے۔ دوسری طرف جب وہ اپنے ان بزرگوں کی زندگی کا مشاہدہ اور تجزیہ کرتے ہیں جن کے کندھوں پر تربیت کی ذمہ داری ہے تو یہ دیکھ کر وہ شدید احساسِ محرومی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ قال اور حال میں ایک حد قائم ہے۔ اس طرح وہ کبیدہ خاطر ہو کر وہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں جو ہمارے حق آشنا بزرگوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ ہم بحیثیت بزرگ بار بار اعلان کرتے ہیں کہ نوجوان نسل کے ذہنوں سے بزرگوں کے لئے ادب و احترام اُٹھ گیا ہے۔ اُن کے اندر وہ اخوت و محبت نہیں رہی جس کے اوپر ایک مثالی معاشرہ تعمیر کیا جاتا ہے۔

خدارا! اپنے گریبان میں مُنہ ڈالئے۔ یہ بھی تو دیکھئے کہ ہمارے قول و فعل میں کتنا تضاد واقع ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود کہ ہم اپنا اختیار استعمال کر کے اس منافقانہ زندگی کو بدل سکتے ہیں، ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ ہم جو کچھ خود نہیں کر سکتے اُس کی توقع اپنی اولاد سے کیوں کرتے ہیں۔ آج اگر ایک باپ جھوٹ کی ملمع شدہ زندگی میں قید ہے تو وہ اولاد سے کیوں کر توقع کر سکتا ہے کہ وہ سچی اور حق آشنا زندگی گزارے گی۔

ہمارا حوصلہ کم ہے۔ ہم ہیرا پھیری کر کے چوری کرتے ہیں۔ نوجوان خون اس منافقانہ طرزِ عمل کو مہمیز دیتا ہے اور مسجد میں تراویح پڑھنے والوں کی گاڑیاں چرا لیتا ہے اور کسی قتل میں ملوث ہو جاتا ہے تو ہم شور کرتے ہیں نوجوان نسل بے راہ ہو گئی ہے۔ ہمارے بچے ماں کے پیٹ سے قاتل، چور، ذخیرہ اندوز، منافق، اسمگلر پیدا نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کو جو کچھ کرتے دیکھا ہے، ترقی دے کر اُسے فن بنا دیا ہے۔

اخبارات کے پورے پورے کالم اور کئی کئی سو صفحات کی کتابیں لکھی جا رہی ہیں کہ اس سے نوجوان نسل کی اصلاح مقصود ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رشد و ہدایت کے ان طوفان خیز دعووں کے ساتھ اگر نوجوان نسل کے بڑوں نے اپنی اصلاح نہیں کی تو حالات نہیں سدھریں گے۔ ہم یہ بات کیوں بھول رہے ہیں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کا ذہن سادہ ورق کی طرح ہوتا ہے۔ وہ وہی عادات و اطوار اختیار کرتا جو ماحول میں رائج ہیں۔ ایک فردِ واحد بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ بچہ وہی زبان بولتا ہے جو اس کے ماں باپ بولتے ہیں۔

ماحول کو سنوارنے اور سُدھارنے کے لئے یہ امر لازم ہے کہ ہم پہلے اپنی اصلاح کریں۔ اپنے قول و فعل اور کردار سے یہ ثابت کر دیں کہ ہم معاشرے کے اُن افراد میں سے ہیں جو ہدایت یافتہ اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ دراصل ہمارے نونہال من حیث القوم ہمارے کردار کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

پاک و بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے ہمیں معین مقداروں کے ساتھ تخلیق کیا۔ اور ان مقداروں کو ان اوصافِ حمیدہ سے زینت بخشی جو بحیثیت خالقِ کل اُس کے پسند ہیں۔ وہی ہے جس نے ہمیں برگزیدہ گروہ میں شامل کیا جس سے وہ خوش ہوا اور ہمیں توفیق دی کہ ہم اپنے رب کو پکاریں اور روزہ رکھیں، وہ روزہ جس کی جزا خود اللہ ہے۔

سعید ہیں وہ لوگ جنہوں نے رمضان المبارک کی سعادتوں کو حاصل کیا۔ دن میں اور رات میں حضورِ قلب سے اللہ کی طرف متوجہ رہے، اپنے بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اور ان کی خدمت انجام دی۔

● ●

دُعا

سائنس کا یہ نظریہ اتنا عام ہو چکا ہے کہ ابتدائی کلاسوں کے طالب علم کسی بچہ سے بھی اگر استفسار کیا جائے تو وہ برملا کہے گا :

ہر بات، ہر عمل، ہر کردار، انتہا یہ کہ ہماری آواز، ہماری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ فضا میں لہروں کے دوش پر محوِ پرواز رہتا ہے۔

اگر ہم کسی طرح آواز کے قطر کو سولہ سو قطر (WAVE LENGTH) سے زیادہ یا چار سو قطر سے کم کرنے پر قادر ہو جائیں تو ہم ہزاروں لاکھوں سال پہلے گزرے ہوئے اپنے اسلاف کی آوازیں سن سکتے ہیں اور اُن تک اپنی آرزوئیں اور تمنائیں پہنچا سکتے ہیں۔

دُعا بھی ایک آرزو اور تمنا ہے۔ اس کا منتہا وہ ذات اقدس و اکبر ہے جس کے احاطۂ قدرت میں ہر چیز ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ جب چاہے، جس طرح چاہے کائنات کے جاری و ساری نظام میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ اب سے چودہ سو سال پیشتر جب مسلمانوں کے کردار کی عظمت کا غلغلہ تھا، دنیائے کفر و استبداد پر اسلام کے شیدائیوں کی حاکمیت قائم ہوتی چلی گئی۔ ہیبت و جبروت کا عالم یہ تھا کہ بیت المقدس کے محافظین نے اللہ کے پاک گھر کی کنجیاں بدستِ خود پیش کر دی تھیں۔ پھر ایک ایسا دَور آیا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط قوم فرقوں میں بٹ گئی۔ مسلمانوں میں کردار کی پاکیزگی گہنا گئی اور مسلمان سمٹتا چلا گیا۔ اتنا سمٹا، اتنا کمزور ہوا کہ اُس کا شیرازہ بکھر گیا۔

جب سے ہوش و حواس کا پہلا قدم زندگی کی منزل میں رکھا ہے ایک ہی بات کانوں نے سنی، آنکھوں نے دیکھی کہ مساجد میں، نجی محفلوں میں، منبروں پر، لاکھوں کے مجمع میں دعا کی جا رہی ہے کہ یا اللہ ہمیں دشمنوں پر فتح عطا کر۔ دوسری بات جو بچپن سے اب تک سننے میں آئی وہ یہ ہے کہ اسرائیلی مغضوب ہیں اور ان کی حکومت کبھی قائم نہیں ہوگی کہ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ کی یہی تفسیر پیش کی جاتی ہے۔

یارو! یہ کیسا غضب ہے کہ اغیار ہمارے تشخص کو بربریت اور ظلم و تشدد سے مسلسل پامال کر رہے ہیں اور ہم روز افزوں پستی کی طرف گامزن ہو کر ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سَافِلِیۡنَ کی زندہ تصویر بن گئے ہیں۔ عمل سے کوسوں دُور صرف دُعا پر اکتفا اور تکیہ کئے بیٹھے ہیں۔

جس طرح آوازیں فضا میں گشت کرتی رہتی ہیں، دعاؤں کے ساتھ عمل نہ ہو، کردار نہ ہو، اخلاص نہ ہو تو یہ دعائیں بھی زمین کے کناروں سے باہر نہیں نکلتیں۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق وہ دُعائیں مقبولِ بارگاہ ہوتی ہیں جن کے ساتھ مسلسل اور پیہم عمل ہو۔ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس اور اطہر زندگی ہمارے سامنے ہے۔ حاصلِ کائنات، اللہ کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محض زبانی جمع خرچ کا درس نہیں دیا۔ مسلسل حرکت اور جد و جہد سے تعمیرِ زندگی کا اعلیٰ و ارفع نمونہ پیش کیا ہے۔ ہم زبانی دعویٰ تو بہت کرتے ہیں مگر عمل کے میدان میں ہماری حیثیت برگ و بار کی نہیں، کانٹوں کی ہے۔ کون نہیں جانتا جھوٹ، اقربا نوازی، ذخیرہ اندوزی، غیبت، آپس میں پھوٹ ڈالنا، دوسروں کو کمتر جاننا، زندگی کے بلند معیار کے لفظوں میں خود کو گرفتار کر لینا کربناک عذاب ہے۔ ہم دوزخ کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ہائے!

غیبی آوازیں دے رہا ہے کہ جدھر کا رُخ ہے وہ صعوبت کی راہ ہے مگر افسوس سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود ہم نے اپنی زندگی کو عقوبت خانہ بنالیا ہے۔

ہادیٔ برحق، سرتاج انبیاء، مجسم رحمت، محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا ہے جو لمبی مسافت طے کرکے مقدس مقامات پر حاضری دیتا ہے۔ غبار میں اٹا ہوا ہے، گرد آلود ہے اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر کہتا ہے:

اے میرے رب! اے میرے رب!

حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام ہے، اس کا لباس حرام ہے اور حرام ہی سے اس کے جسم کی نشو ونما ہوئی ہے تو ایسے شخص کی دُعا بھلا کیسے قبول ہو سکتی ہے۔

آج کے معاشرہ میں ہماری روزی، ہمارا رہن سہن، ہمارا معیارِ زندگی، ہمارا قول و فعل رسولؐ اللہ کی زندگی سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے، یہ سب ہمارے سامنے ہے

●●●

مائیکروفلم

نظامِ شمسی کی طرح نظامِ انسانی کا بھی مرکز و محور ہے۔ عالمِ انسانیت کے نظام اور مرکز کے انکشاف کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس قانون سے واقف ہوں جس کی بنیاد پر اس نظام کا ہر متحرک سیارہ اپنے مرکز کے گرد گھومتا ہے۔

نظامِ انسانیت میں بھی بے شمار سیارے اپنے مرکز کے گرد گھومتے ہیں اور انسانوں اور آبادیوں کے ہجوم ان مراکز کے گرد طواف کرتے ہیں۔ یہ عمل صرف زمین والوں پر موقوف نہیں۔ آسمانوں میں بھی صرف اُن ہی ناموں کی پکار ہوتی ہے جو اپنے مرکز سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے:

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیلؑ سے فرماتا ہے میں فلاں بندے کو دوست رکھتا ہوں، تم بھی اس کو دوست رکھو۔ پس جبرئیل بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ جبرئیل آسمان والوں میں اس کی منادی کر دیتا ہے تو تمام آسمان والے بھی اس کو چاہنے لگتے ہیں اور اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔ پھر جب آسمان پر اس کی محبوبیت کا اعلان ہو جاتا ہے تو زمین والوں کے دل بھی اس کی محبت کے لئے کھل جاتے ہیں اور اس کو ہر طرف مقبولیت اور محبوبیت حاصل ہو جاتی ہے۔

عالمِ انسانی کے یہ وہ قدسی نفس حضرات ہیں جو اپنے اندر کام کرنے والے

کہکشانی نظام سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی بندہ اپنے INNER سے واقف ہو جاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے سے TIME & SPACE کا پردہ اُٹھ جاتا ہے تو وہ دیکھ لیتا ہے کہ سب کچھ اس کے اندر ہے۔ ذاتِ انسانی کے اندر ایک نقطہ ہے اور یہ نقطہ کائنات کی مائیکرو فلم ہے۔ اس نقطہ کو جب پھیلنے اور نشر ہونے کا موقع دیا جاتا ہے تو ساری کائنات دماغ کی اسکرین پر فلم بن کر متحرک ہو جاتی ہے۔

اس نقطہ کی ایک بھرپور اور دل کش مثال برگد کے درخت کے بیج سے دی جا سکتی ہے۔ برگد کا بیج جو خشخاش کے دانے سے چھوٹا ہوتا ہے، جب زمین کی کوکھ ایک خاص پروسس کے تحت اس کو حرارت پہنچاتی ہے تو بیج کے اُوپر کا پرت اُتر جاتا ہے اور اندر سے برگد کا درخت نمودار ہو جاتا ہے۔ پھر اس درخت کی جسامت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے نیچے براتیں تک ٹھہر جاتی ہیں اور اس کی وسعت پھر بھی برقرار رہتی ہے۔ جب خشخاش سے چھوٹے دانے میں ایک برگد کا درخت چھپا ہوا ہے تو انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس کے اندر کیا کچھ نہیں چھپا ہوگا۔

فیضانِ قدرت عام ہے۔ جو کچھ چاہا جاتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔ قدرت انسان کی راہ نمائی میں ہر لمحہ اور ہر آن معروفِ عمل ہے۔ جب ہم ایٹم تلاش کر سکتے ہیں، آواز کی لہروں کو پوری دنیا میں منتشر کر سکتے ہیں، مائیکرو فلم کی تخلیق کر سکتے ہیں تو اپنے اندر اس نقطہ سے بھی وقوف حاصل کر سکتے ہیں جس کے اندر برگد کے بیج کی طرح پوری کائنات ریکارڈ ہے۔

اللہ کے جو بندے آگاہی کے اس ناپید اکنار سمندر میں اُتر جاتے ہیں، اُن کے اوپر سے ٹائم اسپیس کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور زمان سے پیدا شدہ تمام

عوامل رنج و غم، پریشانی و اضمحلال، فکر و تردد سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتے ہیں۔ جب کوئی بندہ اس دائرۂ کار میں منتقل ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کے انعامات و اکرامات کی بارش ہونے لگتی ہے اور ساری کائنات اس کے گرد گھومتی ہے۔

●●●

دولت کے پجاری

دوستو !

چودہ صدیاں بھی بالآخر دم توڑ گئیں۔ جس طرح مرنے کے بعد کوئی واپس نہیں آیا، چودہ صدیوں کے پانچ لاکھ گیارہ ہزار دن اور راتیں بھی واپس نہیں آئیں گی۔ ایک ہزار چار سو سال میں ہم نے کیا کھویا، کیا پایا اس کا محاسبہ ہمارے اوپر فرض ہے۔

روز افزوں سائنسی ترقی نے علمِ حصولی کو معراج بخشی ہے۔ یہ بات اب قرینِ قیاس نظر آتی ہے کہ انسان تسخیرِ کائنات کے اس دائرہ میں داخل ہوا چاہتا ہے جہاں مادہ (MATTER) کی حیثیت نفی بن جاتی ہے۔ یہ بات مشاہدہ بن گئی ہے کہ آدمی روشنیوں کے بے شمار لباسوں سے مزیّن ایک پیکر ہے اور روشنی کے اس لباس پر ہی رنگ و بو کی یہ دُنیا قائم ہے۔ ظاہر بیں نظروں سے دیکھا جائے تو آج کا انسان چودہ سو سال پہلے کے انسان سے بہت ترقی یافتہ ہے، اتنا ترقی یافتہ کہ اس نے نہ صرف یہ کہ آواز کے قطر (WAVE LENGTH) معلوم کر لئے ہیں، اُن کو بڑھانے گھٹانے کا بھی ملکہ حاصل کر لیا ہے۔ ایک ہزار چھ سو قطر سے اوپر کی آوازوں پر اس کی دسترس ہے۔ روشنیوں کے اس ہالے کو جو اصل انسان ہے لہروں میں منتشر کر کے ہزاروں میل کے فاصلے پر پورے خدوخال کے ساتھ پردۂ اسکرین پر منتقل کر دیتا

ہے۔ اسپیس (SPACE) اتنی سمٹ گئی ہے کہ ایک انچ اسپیس (مائکرو فلم) پر سینکڑوں صفحات کی کتاب محفوظ کر لی جاتی ہے۔ ٹائم کا حال یہ ہے کہ ہزاروں میل کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔

لیکن جب ہم ان سب حیرت زدہ کرنے والی تحقیقات اور ترقی کے نتائج پر غور کرتے ہیں تو دل میں ایک ہُوک اٹھتی ہے !

یارو ، یہ کیسی ترقی ہے ! آج کا ہر چہرہ غم و یاس کا عکس ہے۔ آرام و آسائش کے اتنے وسائل کے باوجود آدمی پریشان ہے۔ اس ترقی نے نوعِ انسانی کا سکون چھین لیا ہے۔ سکون کی تلاش میں سرگرداں نوع نئے نئے امراض کا شکار ہے۔ ہر طرف یہ شور و غوغا ہے کہ آدمی، آدمی کی زندگی میں زہر گھول رہا ہے۔ اسلاف کے غیر ترقی یافتہ ماضی کا جب ہم حال سے مقابلہ کرتے ہیں تو یہ جان کر شدید احساسِ کمتری ہوتا ہے کہ تحمل اور بُردباری ان کا شیوہ تھا، افراط و تفریط کا بازار آج کی طرح گرم نہیں بلکہ بالکل سرد تھا۔ بلاشبہ ان کے پاس ٹی وی، وی سی آر، فریج اور ترقی یافتہ دور کی دوسری چیزیں نہیں تھیں، اتنا بہتر لباس انہیں میسر نہیں تھا جو ہم پہنتے ہیں، ایسے عالی شان گھر نہیں تھے جس قسم کے محل نما مکانوں میں ہم رہتے ہیں لیکن اُن کی دنیا سکون آشنا تھی، وہ صحت مند تھے، خوش رہتے تھے، میٹھی نیند سوتے تھے۔ ہر آدمی خود اپنا آئینہ ہے۔ اس آئینہ میں دوسرا رُخ یہ نظر آتا ہے کہ چند جینیس (GENIUS) آدمیوں نے ایک چھوٹے سے ایٹم کو اتنی زیادہ اہمیت دے دی کہ اس کی حیثیت لاکھوں انسانی جانوں سے زیادہ ہو گئی۔ ایسے ایسے سلنڈر انسانوں کے ہاتھوں وجود میں آئے کہ بٹن دبا دینے سے پورے بھرے شہر آکسیجن کی تلاش میں راہیٔ عدم ہو جاتے ہیں۔ سکون کی تلاش میں نیند میں غائب ہو گئیں تو خواب آور دوائیں

کی ایجاد نے خود فریبی میں مبتلا کرکے نیند کی آغوش میں پہنچانے کے بجائے انسان کو حواس باختہ کردیا۔ ایٹمی پروسس نے ایسی بیماریوں کو جنم دیا جو لاعلاج ہیں جن کا نام سن کر ہی آدمی دہشت سے مرجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا :

"اے آدم ، تو اور تیری بیوی جنّت میں رہو اور جہاں سے دل چاہے خوش ہوکر کھاؤ"

"جہاں سے دل چاہے" اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جنّت میں ٹائم اسپیس (TIME and SPACE) کی جکڑ بندیاں نہیں ہوتیں۔ جنّت میں آدم کے اندر ٹائم اسپیس سے آزاد ہونے کی وہی صلاحیت ہے جس سے سائنس نے اسپیس کو توڑ دیا ہے۔ یہ وہی صلاحیت ہے جس کے ذریعے خلاؤں اور آسمانوں پر کمند ڈال دی گئی۔ یہ وہی صلاحیت ہے جس نے فاصلے ختم کر دیئے ہیں۔

اس صلاحیت کو بروئے کار لانے کا مقصد چونکہ دوسرے انسانوں پر اپنی برتری ثابت کرنا تھا اس لئے ساری دنیا کے اوپر مصیبتیں، زحمتیں اور پریشانیاں مسلط ہوگئی ہیں۔ اس ترقی میں اگر صرف اتنی تبدیلی آجائے کہ یہ سب خالصتاً للہ اللہ کی مخلوق کی خدمت کے لئے ہوں تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق یہ بات پوری ہوجائے گی۔

"جہاں سے چاہو خوش ہوکر کھاؤ"

چودہ صدیوں میں ہم جنّت کی اس صلاحیت سے قریب ہوئے ہیں جو ہمیں ٹائم اسپیس سے آزاد کرتی ہے اور اُس صلاحیت سے دُور ہوگئے ہیں جو ہمیں اطمینان و سکون کی زندگی عطا کرتی ہے۔ خدا کرے کہ پندرہویں صدی اس صلاحیت کے لئے پیش رفت ثابت ہو جو ہمیں ہر آن اور ہر لمحہ مسرت و شادمانی سے ہم کنار کرتی ہے اور ہم اس آیتِ مقدسہ کی زندہ تفسیر بن جائیں۔

وَقُلْنَا یٰاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ وَکُلَا مِنْھَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا (سورۂ بقرہ)

اے عزیزو ــــــ!

جو کچھ دنیا میں موجود ہے تمہارے لئے ہے۔ یہ سب رنگ و نور میں ڈھلی ہوئی موتیں ہمارے لئے بنائی گئی ہیں۔ خدا کی ذات کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، مکان اور دکان سے بے نیاز ہے۔ ان سب چیزوں کو ہمارے تابع فرمان کردیا گیا ہے تاکہ ہم اس ساز و سامان سے لطف اندوز و بہرہ ور ہوں۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم دولت اور اس کے ثمر کے غلام بن کر رہ گئے ہیں۔ یہی وہ طرزِ فکر ہے جو چودہ سو سال میں ہم نے اپنے اوپر مسلط کرلی ہے۔

آیئے عہد کریں ــــ!

کہ پندرہویں صدی میں ہم دولت کے پجاری نہیں بنیں گے۔ دولت کو اپنے زیرِ دست غلام اور کنیز بنا کر رکھیں گے، ایسی کنیز جس کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ اس نے کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کی اور جس کے اندر ذہنی مرکزیت انسان کے اوپر آلام و مصائب کا دردناک عذاب ہے ــــــ

●●●

ستائیس جنوری

آؤ یار د ـــــ دلدار کی باتیں کریں ـــــ!

جنوری کا مہینہ پہلے بھی اپنی تمام تر رعنائیوں، مسرتوں، خوشیوں، رنج والم، داغِ مفارقت، رُوح کی بے تابی کے ساتھ آتا رہا ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

کائنات ایک ایسی حرکت ہے جو ایک لمحے کے لئے بھی رُک جائے تو رنگ رنگ خوشبو فضائے بسیط میں تحلیل ہو جائے گی۔ جنوری کے آخری عشرے میں کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو نم ناک نہ ہوئی ہو، کوئی دل ایسا نہ تھا جس کی حرکت عارضی طور پر نہ رک گئی ہو۔ آب و گِل کی دنیا کے عالم میں بھی اور عالمِ بالا میں ایک جشن کا سا سماں تھا۔

۲۷۔ جنوری سنہ ۱۹۷۹ء کی رات جب کہ دن رات کے کنارے ایک دوسرے سے آملنے کے لئے بے قرار تھے، قلندر بابا اولیاءؒ کو خالقِ حقیقی نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

نورانی لوگوں کی باتیں بھی روشن اور منور ہوتی ہیں۔ زندگی میں اُن کے ساتھ ایک لمحے کا تقرب سو سالہ طاعت بے ریا سے افضل ہے اور عالمِ قدس میں چلے جانے کے بعد ان کی یاد ہزار سالہ طاعت بے ریا سے افضل و اعلیٰ ہے کہ ایسے مقرب بارگاہ بندوں کے تذکرے سے آدمی کا انگ انگ اللہ تعالیٰ کی قربت کے تصور سے رنگین ہو جاتا ہے۔

لازوال ہستی اپنی قدرت کا فیضان جاری و ساری رکھنے کے لئے ایسے بندے تخلیق کرتی رہتی ہے جو دنیا کی بے ثباتی کا درس دیتے ہیں۔ خالقِ حقیقی سے تعلق قائم کرنا اور آدم زاد کو اس سے متعارف کرانا اُن کا مشن ہوتا ہے۔

آئیے! آج کی نشست میں دل دار، دل نواز کی باتیں کریں ـــــ اس لئے کہ انسان دوستی کا تقاضا ہے کہ انسانیت نواز دوست کی آواز کی ہر "آوازِ دوست" کے صفحے پر بکھیر دی جائیں، اس طرح کہ ایک مرقع تصویر سامنے آجائے۔

فرمایا قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے:

"نوعِ انسان میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب آپس میں آدم کے ناطے خالقِ کائنات کے تخلیقی راز و نیاز ہیں، آپس میں بھائی بہن ہیں ـــــ نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ بڑائی صرف اس کو زیب دیتی ہے جو اپنے اندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے، اللہ کی صفات کے سمندر کا عرفان رکھتا ہو، جس کے اندر اللہ کے اوصاف کا عکس نمایاں ہو، جو اللہ کی مخلوق کے کام آئے، کسی کو اس کی ذات سے تکلیف نہ پہنچے۔

نیکی کی تبلیغ کرنے والا پہلے خود نیک ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح بدکردار آدمی دل کا خود بُرا ہوتا ہے تب اس سے بدی یا دوسروں کی بربادی کے کام رُونما ہوتے ہیں۔

غصہ کی آگ پہلے غصہ کرنے والے کے خون میں ارتعاش پیدا کرتی ہے اور اُس کے اعصاب متاثر ہو کر اپنی انرجی (ENERGY) ضائع کر دیتے ہیں یعنی اس کے اندر قوتِ حیات ضائع ہو کر دوسروں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی کے لئے کسی قسم کے بھی نقصان کو پسند نہیں فرماتے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"جو لوگ غصہ پر کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں، اللہ ایسے احسان کرنے والے بندوں سے محبت کرتا ہے۔"

شمع پہلے خود جلتی ہے اور جب وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ آگ کی نذر کر کے خود کو فنا کر دیتی ہے تو شمع کے اس ایثار پر پروانے جاں نثار ہو جاتے ہیں۔

جو خود عارف نہیں ہے وہ کسی کو عارف کیسے بنا سکتا ہے۔ جو خود قلاش اور مفلوک الحال ہے وہ کسی کو کیا خیرات دے گا!

یہ کیسا المناک اور خوفناک عمل ہے کہ ہم دوسروں کو نقصان پہنچا کر خوش ہوتے ہیں جب کہ آدم ذات کے رشتے کے پیش نظر ہم خود اپنی جڑ کاٹتے ہیں۔ درخت ایک ہے، شاخیں اور پتے لاتعداد ہیں۔ اگر کوئی شاخ خود اپنے درخت کی جڑ پر ضرب لگائے تو یہ کیسی نادانی کی بات ہے کہ وہ خود کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے۔ خوشی اگر ہمارے لئے سراجِ تمنا ہے تو ہم اپنے ہم جنسوں کو تکلیف پہنچا کر کیسے خوش رہ سکتے ہیں!

ہر انسان دوسرے انسان سے ہم رشتہ ہے۔ ہر انسان دوسرے انسان سے اس لئے متعارف ہے کہ اس کے اندر "زندگی بننے والی لہریں" ایک دوسرے میں رد و بدل ہو رہی ہیں۔ پُرمسرت محفل میں جہاں سینکڑوں ہزاروں افراد آلام سے بے نیاز خوشیوں کے لطیف جذبات سے سرشار ہیں، وہاں ایک فرد کی المناکی ساری محفل کو مغموم کر دیتی ہے ـــــ آخر ایسا کیوں ہے؟

اس لئے کہ پوری نوع کے افراد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہیں۔ ایک کڑی کمزور ہو جائے تو ساری زنجیر کمزور ہو جاتی ہے، ایک کڑی ٹوٹ جائے تو زنجیر میں جب تک دوسری کڑی ہم رشتہ نہ ہو جائے زنجیر نہیں

کہلاتی۔ قرآن کا ارشاد ہے:

"متحد ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔"

اتحاد و یگانگت ماضی کو پُروقار، حال کو مسرور اور مستقبل کو روشن اور تابناک بناتی ہے۔

مصور ایک تصویر بناتا ہے۔ پہلے وہ خود اس تصویر کے نقش و نگار سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ مصور اگر خود اپنی بنائی ہوئی تصویر سے مطمئن نہ ہو تو دوسرے کیوں کر متاثر ہوں گے۔ نہ صرف یہ کہ دوسرے لوگ متاثر نہیں ہوں گے بلکہ تصویر کے خد و خال مذاق کا ہدف بن جائیں گے اور اس طرح خود مصور بے چینی، اضطراب و اضمحلال کے عالم میں چلا جائے گا۔ ایسے کام کریں کہ آپ خود مطمئن ہوں، آپ کا ضمیر مُردہ نہ ہو جائے۔ اور یہی وہ راز ہے جس کے ذریعے آپ کی ذات دوسروں کے لئے راہ نمائی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

ہر شخص کو چاہئے کہ کاروبارِ حیات میں پوری پوری جدوجہد اور کوشش کرے لیکن نتیجہ پر نظر نہ رکھے۔ نتیجہ اللہ کے اوپر چھوڑ دے اس لئے کہ آدمی حالات کے ہاتھ میں کھلونا ہے۔ حالات جس طرح چابی بھر دیتے ہیں، آدمی اسی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ بے شک اللہ قادرِ مطلق اور ہر چیز پر محیط ہے۔ حالات پر اس کی گرفت ہے۔ وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے حالات میں تغیر واقع ہو جاتا ہے۔

تمہیں کسی کی ذات سے تکلیف پہنچ جائے تو اُسے بلا توقف معاف کر دو، اس لئے کہ انتقام بجائے خود ایک صعوبت ہے۔ انتقام کا جذبہ اعصاب کو مضمحل کر دیتا ہے۔

تم اگر کسی کی دل آزاری کا سبب بن جاؤ تو اس سے معافی مانگ لو، قطع نظر اس کے کہ وہ تم سے چھوٹا ہے یا بڑا۔ اس لئے کہ جھکنے میں عظمت پوشیدہ ہے۔ قرآن پاک کی

روشنی میں :

"آدمی ناقابلِ تذکرہ شے تھا۔ اس کے اندر اللہ نے اپنی رُوح پھونک
دی پس وہ دیکھتا، سُنتا اور محسُوس کرتا انسان بن گیا۔"

رُوح کیا ہے ؟ رُوح امرِ رب ہے۔ امرِ رب یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے 'ہو' اور وہ ہو جاتی ہے۔

جس فرد کے دل میں شک جاگزیں ہو، وہ عارف کبھی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ شک شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ آدم زاد کو اپنی رُوح سے دور کر دیتا ہے۔ رُوحانی قدروں سے دُوری، آدمی کے اوپر علم و آگاہی اور عرفان کے دروازے بند کر دیتی ہے۔

اللہ والوں کے اوپر رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، تجلیات کی بارش ہوتی ہے۔ ان کے فیوض و برکات کی روشن اور منوّر چادر ایک عالم پر سایہ فگن رہتی ہے۔

●●●

توانائی

برسوں کی تحقیق و جستجو کے بعد طبیعات نے انکشاف کیا ہے کہ کائنات میں جاری و ساری قوتیں جن کی تعداد اب تک چار سمجھی جاتی تھی صرف تین ہیں۔ کم علمی کی بنا پر ایک طاقت کو دو طرح شناخت کیا جا رہا تھا۔ اسی انکشاف پر پاکستانی سائنس داں ڈاکٹر عبدالسلام کو فزکس کا نوبل انعام دیا گیا ہے۔

یہ تفکر بھی سامنے آیا ہے کہ علمی و تحقیقی ارتقا کے ساتھ آج سے پچیس، پچاس یا سو سال کے بعد سائنس اس امر کی شہادت فراہم کرے گی کہ فی الواقع کائنات میں جاری و ساری طاقت صرف ایک ہے جس کو کم علمی کی بنا پر چار، تین یا دو سمجھا جا رہا تھا۔

دوسری طرف سائنس دانوں نے فوٹوگرافی کا ایک ایسا طریقہ اور آلات وضع کئے ہیں جس کے ذریعے اتاری گئی تصویروں نے شہادت دی ہے کہ ہر مادّی وجود کے گرد رنگین روشنیوں کا ایک ہالہ ہے اور اس ہالۂ نور جسے AURA کا نام دیا گیا ہے، کا مطالعہ کر کے بظاہر پوشیدہ ذہنی و جسمانی کیفیات کا انکشاف کیا جا سکتا ہے۔

تیسری طرف جدید نفسیات دریافت کی اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ جب ذہن انسانی کامل یکسوئی کے ساتھ کسی خیال میں مرکوز ہو جاتا ہے تو تحت الشعور اس خیال کو مادّی وجود کے ساتھ منظر بنا دیتا ہے۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ دیگر تمام معاملات کی طرح علمی پیش رفت اور انکشافات

بھی آفاقی قوانین کے تابع ہیں۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق جدوجہد کرتی ہے وہ کامران ہوتی ہے۔ یورپی ممالک اور امریکہ نے جب وسائل میں قید مادے کو اوّلیت دے کر آفاقی قوانین کو حرکت دی تو ان کے اوپر مادی وسائل میں مخفی صلاحیتوں اور طاقتوں کا انکشاف ہوتا چلا گیا اور آج یہ قومیں محض اپنی علمی فضیلت کی وجہ سے برتری حاصل کر چکی ہیں۔

موجودہ سائنس تلاش و جستجو کے راستے پر چل کر اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ پوری کائنات ایک ہی قوت کا مظاہرہ ہے۔ یہ انکشاف نیا نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف میں کتنے ہی لوگ اس بات کو بیان کر چکے ہیں کہ کائنات کے تمام مظاہر کو ایک ہی توانائی کنٹرول کرتی ہے اور اس قوت کا براہِ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط ہے۔ قرآن اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ — اللہ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔

ہم مادی سائنس اور اپنے اسلاف کے علوم کا موازنہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمارے اوپر حیرت کے باب کھل جاتے ہیں کہ آج سے تقریباً آٹھ صدی پہلے حضرت شاہ عبد القادر جیلانی رحہ ایک ایسے عظیم سائنس داں تھے جو فطرت کے قوانین کو جانتے تھے، جن کے وجودِ مسعود سے آفاقی قوانین کے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہوا ہے۔ حضرت شاہ جیلانی رحہ فطرت کے قوانین کے استعمال کا جو طریقہ بتا گئے ہیں اور انہوں نے ان قوانین کو سمجھنے کی جو راہ متعین کی ہے وہاں آج کی سائنس کھربوں ڈالر خرچ کر کے بھی نہیں پہنچ سکی ہے۔

سائنسی علوم کی ترقی اور کامیابی کا ایک بڑا فیکٹر (FACTOR) بجلی یا الیکٹریسٹی (ELECTRICITY) ہے اور اب یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ ہر موجود شے میں برقی اور مقناطیسی (ELECTROMAGNETIC) لہریں موجود ہیں۔ مختلف اشیاء میں

یہ لہریں مختلف تناسب اور مقداروں میں کام کرتی ہیں جب کہ ان لہروں کو ایک بنیادی قوت زندگی مہیا کرتی ہے۔ یہی لہریں ہیں جو زندگی اور زندگی کے تمام عوامل و حرکات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی رحہ نے بتایا ہے کہ زمین اور آسمان کا وجود اس روشنی پر قائم ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا نور فیڈ کرتا ہے۔ اگر نوعِ انسانی کا ذہن مادہ سے ہٹ کر اس روشنی میں مرکوز ہو جائے تو وہ یہ سمجھنے پر قادر ہو جائے گا کہ انسان کے اندر عظیم الشان ماورائی صلاحیتیں ذخیرہ کر دی گئی ہیں جن کو استعمال کر کے نہ صرف یہ کہ وہ زمین پر پھیلی ہوئی اشیاء کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا سکتا ہے بلکہ ان کے اندر کام کرنے والی قوتوں اور لہروں کو حسبِ منشاء استعمال بھی کر سکتا ہے۔ پوری کائنات اس کے سامنے ایک نقطہ یا دائرہ بن کر آ جاتی ہے۔ اس مقام پر انسان مادی وسائل کا محتاج نہیں رہتا۔ وسائل اس کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔

ہم جب قرآن کی تعلیم اور رسول اللہ کی سیرت کو دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو سوائے افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ قرآن کی حقیقی تعلیم اور مسلمانوں کے عمل میں بہت بڑا تضاد واقع ہو چکا ہے۔ قرآن جس راہ کا تعین کرتا ہے، مسلمان جس راہ پر چل رہا ہے یہ دونوں دو ایسی لکیریں ہیں جو آپس میں کبھی نہیں ملتیں۔

اللہ نے انسان کو اپنا نائب بنایا ہے، اس کے اندر اپنی صفات کا علم پھونکا ہے، اس کو اپنی صورت پر تخلیق کیا ہے۔ نائب کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اگر ایک مملکت کا صدر اپنے اختیارات کو استعمال کرنے میں کاغذ قلم کا محتاج نہ ہو تو اس کا نائب اختیارات استعمال کرنے میں کاغذ قلم کا محتاج ہو۔

اللہ وسائل کی محتاجی کے بغیر حاکم ہے تو اس کا نائب بھی وسائل کا دست نگر نہیں ہوتا۔ جس طرح خدا نے 'کن' کہہ کر کائنات کو وجود بخشا ہے، خدا کا نائب بھی اپنے ذہن کو حرکت دے کر خدا کی تخلیق میں تصرف کر سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا نائب اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ کائنات میں موجود تمام مظاہر ایک ہی ذات سے ہم رشتہ ہیں۔

مسلمان کے پاس ماورائی علوم کا جتنا بڑا سرمایہ موجود ہے، وہ اسی مناسبت سے مفلوک الحال ہے۔ مسلمان کے اسلاف نے اس کے لئے حاکمیت اور تسخیر کائنات کے بڑے بڑے خزانے ترکہ میں چھوڑے ہیں لیکن وہ بدنصیب قوم ہے جس نے ہیرے کو پتھر کہہ کر پھینک دیا ہے اور اس خزانے سے مستفیض ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ مصلحتوں کے پیش نظر مسلمان کو تفکر کی راہ سے دور ہٹا دیا گیا ہے اور اس کے سامنے ایسی نہج آگئی ہے جہاں اس کا ہر عمل کاروبار بن گیا ہے۔

کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات کہ قرآن کائنات پر ہماری حاکمیت اور سرداری تسلیم کر رہا ہے۔ ہمارے اوپر حاکمیت اور سرداری کے دروازے کھول رہا ہے اور ہم قرآن کو محض برکت کی کتاب سمجھ کر طاقوں میں سجائے رکھتے ہیں۔ جب کوئی افتاد پڑتی ہے تو اس کی آیات تلاوت کر کے دنیاوی مصائب سے نجات کی دعائیں مانگتے ہیں مگر اس طرف ہماری توجہ مبذول نہیں ہوتی کہ

قرآن میں تفکر اگر ہمارا شعار بن جائے اور ہم اس تفکر کے نتیجے میں
میدانِ عمل میں اتر آئیں تو ساری کائنات پر ہماری سرداری مسلّم ہے۔

افسوس کہ ہم ان خزانوں کو نظر انداز کر کے دوسروں کے دست نگر بنے ہوئے ہیں۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق اللہ نے ہمیں شمس و قمر، نجوم، ارض و سماوات سب پر حاکم بنا دیا

ہے اور اس حاکمیت کو حاصل کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں لیکن ہم ہیں کہ ہر شعبۂ زندگی میں دوسروں کے پس خوردہ نوالوں کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ بیٹھے ہیں۔

ہماری زندگی محض دنیا کے حصول تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ہماری عبادتیں بھی دکھاوے اور دنیاوی برکتیں سمیٹنے کے لئے مخصوص ہو گئی ہیں۔ ہم اعمال کے ظاہری پہلو کو تو بہت اہمیت دیتے ہیں مگر باطن میں بہتے ہوئے سمندر میں سے ایک قطرۂ آب بھی نہیں پیتے۔ آسمانِ علم و آگاہی کے خورشید منفرد اور تسخیر کائنات کے فارمولوں کے ماہر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

اے منافقو ! کلامِ نبوت سنو۔
آخرت کو دنیا کے عوض فروخت کرنے والو !
حق کو مخلوق کے عوض بیچنے والو !
باقی کو فانی کے بدلے کاروبار کرنے والو !
تمہارا بیوپار سراسر خسارے کا سودا ہے، تمہارا سرمایہ تمہیں بربادی کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے، افسوس تم پر۔ تم اللہ کے غضب کا ہدف بن رہے ہو ——— !

●●●

پرندے

ماحول میں اپنے جانکار لوگوں کی طرزِ فکر کا مشاہدہ کیا جائے تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی عنوان سے پریشان ہے۔ پریشانی اور خود بیزاری اُس کے اوپر مسلط ہے۔ زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ ماہ و سال کی گردش ایک ثانیہ بن گئی ہے۔ آسائش و آرام کی طلب نے آدمی کے تشخص کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔

دماغ کے اندر دو کھرب خلیے اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ ہر ہر قدم پر متوجہ کرتے ہیں کہ ملمع شدہ دنیا نہ صرف یہ کہ ایک فرد کے لئے بلکہ پوری نوعِ انسانی کے لئے زہر ہلاہل ہے مگر آدم و حوا کے وجود کا میراثِ آدم زاد دماغ کی فریاد پر کان نہیں دھرتا ایسا لگتا ہے کہ دلوں پر اور کانوں پر مُہر لگ گئی ہے اور آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ یہ سب کیوں ہے اور نوعِ انسانی اپنے اُوپر عذاب کیوں مسلط کئے ہوئے ہے؟ اس کا جواب بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ

● ——— ہم نے کھنکنے چاندی کے ٹھیکروں کو زندگی کی معراج بنا لیا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ آدم زاد کی طرح چوپائے اور پرندے بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ ان کے اندر بھی احتیاج ہے۔ انہیں بھی بھوک پیاس لگتی ہے۔ اے آدم زاد! کبھی تو نے سوچا کہ روزی رساں اتنی بڑی مخلوق کو کس طرح روزی فراہم کرتا ہے۔

کسان جب کھیتی کو سمیٹتا ہے تو جھاڑو سے ایک ایک دانہ سمیٹ لیتا ہے۔ اس کی

کوشش ہوتی ہے کہ زمین پر ایک دانہ بھی نہ رہے۔ لیکن اربوں کھربوں کی تعداد میں اللہ کی مخلوق اپنا پیٹ بھرتی ہے اور تمام غذائی ضروریات پوری کرتی ہے۔

اللہ کی شانِ کریمی ہے کہ جب آسمان پر پرندوں کا غول دانہ چگنے کے لئے اپنے پنجوں اور گردن کو کشش ثقل کے تابع کرتے ہوئے زمین کی طرف آتا ہے تو اس سے پہلے کہ زمین پر اُتریں وہاں اُن کی غذائی ضروریات تخلیق ہو چکی ہوتی ہیں۔ اربوں کھربوں پرندے آدمی کی طرح وسائل کے محتاج نہیں ہیں۔

زمین پر اُترنے سے پہلے پرندوں کی غذائی ضروریات کیسے تخلیق ہو جاتی ہیں؟ یہ ایک راز ہے مگر ایک ایسی حقیقت ہے نوعِ انسانی کے افراد جس کا ہر وقت مشاہدہ کر سکتے ہیں اسرار و رموز کے عارف، اللہ کے دوست حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کا ایک دوہا کیا خوب ہے! بابا تاج الدینؒ داس ملوکا تخلص کرتے تھے۔

اجگر کریں نہ چاکری، پنچھی کریں نہ کام
داس ملوکا کہہ گئے سب کے داتا رام

بابا صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ چوپائے ملازمت نہیں کرتے اور پرندے کاروبار نہیں کرتے لیکن اللہ تعالیٰ سب کو روزی فراہم کرتا ہے۔

جب دلوں پر اور کانوں پر مُہر لگ جاتی ہے تو کوئی بات اثر نہیں کرتی، مگر کیا کیا جائے! ———

مجھے ہے حکمِ اذاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

ایک دیوانگی یہ ہے کہ معاشرتی اقدار کو پامال کر کے آدمی سونے چاندی کو سب کچھ سمجھ بیٹھا ہے۔ بالکل اس کے متوازی (PARALLEL) دوسری دیوانگی یہ ہے۔

——— اس کے باوجود کہ کوئی نہیں سنتا، ہم سنائے جاتے ہیں ———

حضرت عیسیٰؑ تبلیغی سفر میں تھے کہ ایک یہودی مُلّا نے عرض کیا: "میں بھی آپ کے ساتھ شریکِ سفر ہونا چاہتا ہوں۔"

حضرت عیسیٰؑ نے یہ درخواست منظور فرمالی۔ چلتے چلتے جب سورج کی تمازت بڑھی اور زمین تپ کر تانبا بن گئی تو یہ دونوں صاحبان ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ طے پایا کہ کھانا کھایا جائے۔ دونوں صاحبان نے اپنے اپنے دسترخوان کھولے۔ یہودی مُلّا کے دسترخوان میں تین روٹیاں تھیں اور حضرت عیسیٰؑ کے پاس دو۔ یہودی نے جب یہ دیکھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے پاس دو روٹیاں ہیں تو اس نے فوراً اپنا کھانا چھپالیا۔ اور کہا: "اے پیغمبر! میں آپ سے عمر میں بڑا ہوں، آپ کے مقابلے میں میرے اعصاب کمزور ہیں۔ کھانے کے لئے پانی کی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ زحمت کرکے پانی لے آئیں۔"

حضرت عیسیٰؑ پانی لینے کے لئے گئے تو مُلّا نے ایک روٹی کھالی۔ دونوں جب کھانے کے لئے بیٹھے تو حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا کہ تمہارے پاس تین روٹیاں تھیں؟ مُلّا نے کہا آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ خاموش ہو گئے۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں صاحبان لیٹ گئے۔ مُلّا سو گیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے ریت کی تین ڈھیریاں بنائیں اور ان کے اوپر پھونک ماری تینوں ڈھیریاں سونا بن گئیں۔ مُلّا جب بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ سونے کے تین ڈھیر پڑے ہیں۔ حیرت و استعجاب اور خوشی کے عالم میں اس نے پوچھا: "اے پیغمبر! یہ سونے کے ڈھیر کس کے ہیں؟"

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: "ایک میرا ہے، ایک تیرا ہے اور تیسرا اس کا ہے جس نے تیسری روٹی کھائی۔"

مُلّا فوراً بول اٹھا کہ وہ روٹی اسی نے کھائی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا اگر وہ روٹی تو نے کھائی ہے تو سونے کے دو حصّے تیرے ہیں اور ایک حصّہ میرا ہے۔ مُلّا گویا ہوا "آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ پیغمبر ہیں، آپ سونے کا کیا کریں گے! یہ بھی مجھے ہی بخش دیجئے۔"

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: "اگر تو میرے ساتھ شریکِ سفر رہے تو تیسرا حصّہ بھی تیرا ہے۔" اور حضرت عیسیٰؑ وہاں سے اٹھ کر چل دیئے۔ عیسیٰؑ ابھی مُلّا کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے تھے کہ تین آدمی وہاں آموجود ہوئے اور یہودی کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ یہودی مُلّا نے بہت احتجاج کیا مگر ان تینوں آدمیوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ تینوں آدمی ڈاکو تھے جو قانون سے چھپتے پھر رہے تھے۔

بہت بحث و تمحیص کے بعد آخر یہ طے ہوا کہ سونے کے دو ڈھیر وہ تین آدمی لے لیں اور ایک ڈھیر یہودی کا لے لے۔ ساتھ ہی ان ڈاکوؤں نے یہ شرط رکھی کہ مُلّا بازار سے کھانا لا کر دے، اس لئے کہ سونے کے لالچ میں مخبری نہیں کرے گا۔ قصہ کوتاہ۔ مُلّا کھانا لینے کے لئے شہر کی طرف چل پڑا۔ غم و غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا سوچتا رہا کہ خواہ مخواہ یہ تین آدمی میری دولت کے حق دار بن گئے۔ بے شک یہ لوگ ظالم اور جابر ہیں۔ ان کو معاف کرنا بجائے خود ناانصافی اور ظلم ہے۔ بازار سے کھانا لینے کے بعد مُلّا نے اس میں زہر ملا دیا۔ ادھر ان تینوں آدمیوں نے یہ سازش کی کہ جیسے ہی مُلّا کھانا لے کر آئے اُسے قتل کر دیا جائے اس لئے کہ مُلّا کباب میں ہڈی بن گیا ہے۔ سونے کی تین ڈھیریاں ہیں اور ہم تین آدمی اس کے صحیح وارث اور حق دار ہیں۔ اگر یہودی کو بیچ سے ہٹا دیا جائے تو تقسیم صحیح طور پر عمل میں آجائے گی۔

جیسے ہی مُلّا زہر آمیز کھانا لے کر آیا، اُن تین میں سے ایک نے اُسے قتل کر دیا اور تینوں آدمی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ ابھی کھانے کے چند لقمے بھی پیٹ میں نہ اُترے تھے

کہ تینوں کی رُوح پرواز کرگئی۔

یہ بات بہت زیادہ محلِ نظر ہے :-

یہودی کسی ایک فرد کا نام نہیں ہے۔ انجیل کے اس بیان میں طرزِ فکر کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہودی ملّا سے مراد دنیا پرست اور لالچی بندہ ہے خواہ وہ کسی بھی معاشرے کا فرد ہو۔

دولت پرستی کی چھاپ ہمارے اوپر اتنی گہری اور نمایاں ہے کہ ہم لالچی ملّا کی زندہ تصویر بن گئے ہیں۔ ہر شخص دنیا کی حرص اور لالچ میں مبتلا ہے۔ حرص و ہوس کا جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے واقعہ مذکور میں اس کی پوری فلم موجود ہے ـــــ ہے کوئی جو عبرت حاصل کرے ـــــ !

فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ

سکون

تمام مذاہب کی یہ تعلیم عام ہے کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ امتحان میں کامیابی فرد اور قوم کے لئے سکون و راحت کا ذریعہ ہے۔ جو فرد یا قوم امتحان میں فیل ہو جاتی ہے نارِ جہنم اس کا ٹھکانا ہے۔

دنیا عالمِ ناسوت ہو، دنیا عالمِ نور (جنّت) ہو۔ دونوں میں انسان کے لئے آسائش و آرام کے سامان مہیا ہیں۔ گھر اور بالاخانے جس طرح دنیا میں لوگوں کے لئے پناہ گاہ ہیں اسی طرح جنّت میں بھی محلات اپنے باسیوں کے لئے منتظر ہیں۔ مٹی کے بنے ہوئے پھل فروٹ جس طرح یہاں ہمارے لئے لذّتِ کام و دہن ہیں، جنّت میں بھی انگور، انار اور سیب بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس عالمِ آب و گِل میں عورت مرد کے لئے اور مرد عورت کے لئے جس طرح سکونِ قلبی، راحتِ دماغ بنے ہوئے ہیں، رنگ و روشنی کے عالمِ جنّت میں بھی حور و غلماں کا وجود ہمارے سامنے ہے۔ آبِ شیریں اگر عالمِ سفلی میں ہمارے لئے آبِ حیات ہے تو جنّت بھی آبِ کوثر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ کیف و مستی اور رنج و غم زمان و مکان (TIME & SPACE) کے بند پنجرے میں ہمارے اوپر وارد ہوتے ہیں۔ یہی دونوں رُخ اُس عالم میں جنّت اور دوزخ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

ہر انسان کے اندر سطحی اور گہری سوچ موجود ہے۔ تفکر جب گہرا ہوتا ہے تو بجز

اس کے کوئی بات سامنے نہیں آتی کہ ہر آدمی جنت اور دوزخ اپنے ساتھ لئے پھرتا ہے اور اس کا تعلق طرزِ فکر سے ہے۔ طرزِ فکر آزاد اور انبیا علیہم السلام کے مطابق ہے تو آدمی کی ساری زندگی جنت ہے۔ طرزِ فکر میں ابلیسیت ہے تو تمام زندگی دوزخ ہے۔

جس کے پاس زر و جواہر کے انبار ہیں وہ بھی دو روٹی کھاتا ہے اور ستر پوشی کے لئے دو کپڑے پہنتا ہے۔ جس کے پاس دولت نہیں ہے وہ بھی دو روٹی کھاتا ہے اور دو کپڑے زیب تن کرتا ہے۔ جس کے پاس دس کمروں کا محل ہے وہ ایک چارپائی کی جگہ سوتا ہے۔ کسی نے نہیں دیکھا کہ محل میں رہنے والا آدمی سوتے وقت اتنا پھیل جاتا ہو کہ سونے کے لئے ایک چارپائی سے زیادہ جگہ کی ضرورت اُسے پیش آئے۔

وسائل کی تقسیم میں فرق واقع کیا جا سکتا ہے مگر زندہ رہنے کے لئے سب کی ضروریات یکساں ہیں۔ خورد و نوش کے لئے سامان کا انبار ہو، روپے کی ریل پیل ہو، اس کے برعکس وسائل کمی کے ساتھ موجود ہوں۔ دونوں حالتوں میں یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ سکون آشنا زندگی سے ہم کنار ہوں۔ سکون آشنا زندگی سے ہم آغوش ہونے اور اطمینانِ قلب کے لئے ایک الگ طرزِ فکر ہے اور وہ طرزِ فکر یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ سے واقف رہو۔ خود سے وقوف حاصل کرنا حقیقت پسندانہ عمل ہے اور حقیقت سے فرار فکشن (FICTION) اور مفروضہ زندگی ہے۔

آج ہم ایک ایسے عہد میں سانس لے رہے ہیں جہاں ہر روز نت نئے انکشافات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کھوج کی اس دُنیا میں انسان سمندر کی تہ میں جا کر وہاں کے رازہائے سربستہ عام کرنے کی فکر میں سرگرداں ہے۔ رازہائے سربستہ کا متلاشی انسان ستاروں پر کمندیں ڈال چکا ہے۔ نئی تحقیق کی راہ، مریخ، اب اس کے سامنے ہے۔ ان

سب مشاہدات کے بعد انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ تحقیق و تلاش کا عمل اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے گا جب تک انسان خود کو تلاش نہ کرے۔ ضرورت ہے کہ اپنے اندر ماورائی صلاحیتوں کو دریافت کیا جائے۔ غیر مسلم اقوام نے اسی ارادے کے ساتھ اپنے شعور کی گہرائیوں میں سفر شروع کر دیا ہے۔ انہیں ایک نئی بصیرت کی تلاش ہے جو آدم زاد کی پُر آلام زندگی کی تشکیلِ نو کر سکے۔

بے قراری اور اضطراب سے رستگاری حاصل کرنے کے لئے، اسلاف سے جو ہمیں ورثہ ملا ہے اس کا نام مراقبہ ہے۔ مراقبہ کے ذریعے ہم اپنے اندر مخفی صفات کو منظرِ عام پر لا سکتے ہیں۔ مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام اور تمام اولیاء اللہ کا معمول رہا ہے۔ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے پہلے غارِ حرا میں ایک عرصے تک مراقبہ کیا ہے۔

وجدانی کیفیات کے حصول کی غرض سے ایک سروے رپورٹ کے مطابق امریکہ میں مراقبہ کرنے والوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ ان اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ امریکہ جیسے خود کفیل ملک میں بھی سکونِ قلب حاصل کرنے اور زندگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ گزارنے کے لئے لوگ اولیاء اللہ کی طرزِ فکر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

مراقبہ کے ذریعے جہاں ہم خود اپنا ادراک کر سکتے ہیں، ماضی اور مستقبل بھی ہمارے سامنے ایک کھلی کتاب بن جاتا ہے اور اس ادراک کی روشنی میں خوش آئند زندگی ہمارا مقدر بن جاتی ہے۔

●●●

آتش فشاں

دوستو ــــ! میں کون ہوں ؟
بھائیو ــــ! آپ کون ہیں ؟
ساتھیو ــــ! یہ دنیا کیا ہے ؟
عزیزو ــــ! یہ کیسی بقا ہے کہ ہر لمحہ فنا کے دوش پر رقصاں ہے ؟

ہُوا یوں کہ رات کے وقت جب آسمان جگ مگ کر رہا تھا اور انوار کی لطیف فضا میں ستاروں کی محفل سجی ہوئی تھی، ایک روشن ستارہ اپنی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ ہر گھنٹے کے بعد یہ ستارہ اپنی جگہ سے آگے بڑھ جاتا۔ ساری رات کا سفر طے کر کے یہ ستارہ مشرق کو چھوڑ کر مغرب میں اپنا مسکن بنا چکا تھا۔

میں یہ نہیں جان سکا کہ زمین چل رہی تھی یا ستارہ متحرک تھا۔ صحن میں تخت پر لیٹے لیٹے پوری رات کی روئیداد صرف اتنی ہے کہ ستارہ مشرق سے مغرب میں جا چکا تھا اور اس کے اوپر دن کی روشنی غلاف بن چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ دن بھر ستارہ سفر کر کے رات کو پھر اسی جگہ آ جائے گا جہاں سے مشرق میں پہنچا تھا اور یہ عمل جاری و ساری ہے۔

جس طرح ستارے اور زمین گردش میں ہیں؟ کائنات کا ایک ایک ذرہ اپنے اپنے ا،ا،ز میں متحرک ہے ــــ انسان جس کے لئے یہ ساری کائنات تخلیق کی گئی ہے وہ بھی ہر لمحہ اور ہر آن جذبات و احساسات کی دنیا میں ردّ و بدل ہو رہا ہے۔ آنے والا

ہر لمحہ ماضی ہے اور ماضی فنا ہے۔ فنا کا وجود ہی دراصل بقا ہے۔ فنا نہ ہو تو بقا کا تذکرہ بے سود ہے۔ انگوٹھا چوستے بچہ کا بچپن جب فنا کے مراحل سے گزر جاتا ہے، تو لڑکپن وجود میں آتا ہے یعنی بچپن کی فنا لڑکپن اور جوانی ہے اور جوانی کی فنا بڑھاپا ہے بڑھاپا فنا ہو جاتا ہے تو ہم دوسرے عالم میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک پروسس (PRO-CESS) ہے جو جاری ہے۔

جس طرح بچپنا مر کر جوانی پیدا ہوتی ہے اور جوانی کے اوپر موت وارد ہونے کے بعد بڑھاپا آتا ہے اسی طرح دنیا کے شب و روز بھی مر رہے ہیں اور پیدا ہو رہے ہیں۔ جس طرح آدمی چاہے تو اپنی زندگی کو مختصر اور چاہے تو اس زندگی کو سو سالوں تک پھیلا لیتا ہے یہی حال دنیا کی زندگی کا بھی ہے۔

آج جب کہ ہر طرف ترقی کا فسوں بکھرا ہے، یہ دیکھ کر شدید کرب ہوتا ہے کہ ترقی کے خوش نما اور پُرفریب جال میں دنیا کی عُمر گھٹ رہی ہے۔ زمین بیمار اور عضوِ ضعیف کی مانند کراہ رہی ہے، خدارا میرے اور اپنے اوپر رحم کرو۔ مگر کوئی کان ایسا نہیں ہے کہ اُس کی سسکتی ہوئی اور غم میں ڈوبی ہوئی آواز کو سُنے۔

اپنی برتری حاصل کرنے کے لئے قوموں نے اپنے ایسے ہتھیار بنا لئے ہیں کہ جن کے اوپر موت منڈلا رہی ہے اور ان ہتھیاروں کی موت چار ارب انسانوں کی موت کا پیش خیمہ ہے۔ ایک مرتبہ جب کوئی چیز وجود پا لیتی ہے تو اس کا استعمال ایک ضرورت بن جاتی ہے۔ آج کے دور میں ایٹم بم بنانا اتنا آسان ہو گیا ہے کہ سَو سے زائد افراد کی ایک ٹیم چھوٹی سی فیکٹری میں بیٹھ کر ایٹم بم بنا سکتی ہے۔

جوہری ہتھیاروں کی تیاری اور پھیلاؤ کے سلسلے میں جو زبردست خطرہ کھلی آنکھوں

نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ جب بہت سارے ملکوں کے پاس ایٹمی اسلحے موجود ہوں گے اور آئندہ جب دو پڑوسیوں میں جنگ ہوگی تو اُن کا استعمال ناگزیر ہوگا۔

ساتھیو! یہ کیسی ترقی ہے کہ دنیا اس وقت ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے اور ہم آتش فشاں کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں۔

بالآخر ترقی کا یہ فسوں ایک دن ٹوٹ جائے گا۔ اس سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے کہ وہ قومیں جو فنا اور بقا کے فارمولوں سے ناآشنا ہو گئی تھیں زمین پر سے اُٹھالی گئیں اور آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ خدارا سوچئے ہم کدھر جارہے ہیں۔ موت ہمارے تعاقب میں ہے اور ہم اُسے ترقی کا نام دے کر خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ یہ نتیجہ ہے ان اعمال اور کردار کا جو ہمارے اوپر پشت پا جا کر مسلط ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

(جو کوئی ایک ذرہ بھلائی کرے گا وہ اسے اپنے سامنے پائے گا اور جو کوئی ایک ذرہ برائی کرے گا وہ بھی اُسے اپنے سامنے پائے گا)۔ الزلزال : پارہ ۳۰

●●●

ایٹم بم

خالق کائنات نے کہا: "میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ کے حضور فرشتوں نے دست بستہ اپنی رائے کا اظہار یوں کیا: "یہ بندہ بشر زمین پر خون خرابے کی ایک علامت بن جائے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی بات سُن کر یہ نہیں فرمایا کہ یہ بندہ زمین پر فساد نہیں پھیلائے گا۔ ارشاد ہوا: "میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔" اور آدم کو اپنی صفات کا علم سکھا دیا اور اپنے اس شاہکار کو پیش کر کے فرشتوں سے کہا: "بیان کرو تم اس کے مقابلے میں کتنا علم رکھتے ہو۔"

فرشتے عظمت و جلال سے لرز کر پکار اُٹھے: "ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا علم آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے۔ بے شک آپ علیم اور حکیم ہیں ــــ!"

فرشتوں کے مطابق آدم فسادی اور فتنہ انگیز ہے لیکن اگر اُسے علم الاسماء حاصل ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔ بالفاظ دیگر اگر آدم زاد اللہ کا نائب نہیں ہے تو یہ جیتا جاگتا شر و فساد ہے۔ شر اور فساد کا قدرتی نتیجہ اللہ سے دُوری ہے اور اللہ سے دُوری بندہ کو خوف اور ملال میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خوف زدہ انسان ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں خود کو زیادہ باشعور، زیادہ عقلمند اور زیادہ طاقت ور ثابت کرے۔ دو ہزار سال کے طویل عرصے میں خوف کا یہ

جذبہ بتدریج بڑھتے بڑھتے ایک ایسا پہاڑ بن گیا ہے کہ اس کی وسعت کے سامنے زمین کی اپنی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ خوف سے نجات پانے کے لئے قوموں نے خود اپنی نوع کو برباد کرنے کے لئے ایسی ایسی اختراعات کیں کہ اُن سے زمین کا کلیجہ مُنہ کو آتا ہے اور پھر اس زبوں کاری کا نام ترقی رکھ کر ساری انسانی آبادی کو اضطراب اور بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ آدمی نے خود کو برتر ثابت کرنے کے لئے ایسے ایسے ہتھیار تیار کر لئے کہ دنیا چشم زدن میں بھک سے اُڑ جائے گی۔ نوعِ انسانی کے ان دانشوروں نے جو بلا شبہ اللہ کے نائب نہیں ہیں نت نئے مہلک ہتھیاروں کی ایجاد سے اپنی پیشانیوں کو داغ دار بنا دیا ہے۔ ترقی یافتہ قوم کے باشعور افراد کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت دنیا میں چالیس ہزار ایٹم بم موجود ہیں۔ دیگر روایتی اسلحوں کا تو کوئی شمار و قطار ہی نہیں۔ یہ ترقی کس لئے ہو رہی ہے، کس کے خلاف یہ ہتھیار بنائے جا رہے ہیں، ان خوفناک ہتھیاروں کے استعمال سے کون تباہ ہو گا، کیا یہ خود اپنے گھر کو آگ لگانے کے مترادف نہیں ہے؟

زمین اللہ کی ملکیت ہے، زمین انسانوں کی فلاح و بہبود کا ایک گہوارہ ہے، زمین ہماری جنم بھومی ہے، زمین وہ ہے جس کی کوکھ سے ہمارے لئے قدرت وسائل پیدا کرتی ہے۔ یہ زمین ہی ہے جس کے اوپر لہلہاتے باغ ہمارے لئے اللہ کی نعمتوں کے دسترخوان بن گئے ہیں۔ ہائے افسوس! جس کوکھ میں ہم پرورش پا کر جوان ہوئے ہیں، ہم ترقی کے نام پر اسی کوکھ کو اجاڑ دینا چاہتے ہیں! یہ کیسی ترقی ہے کہ جس سے رنگ رنگ مناظر، سرو و سمن، کوہ و دمن، لالہ و صحرا راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے! یہ ترقی نہیں۔ تنزل ہے، ابتلا ہے، خوف ہے۔ اس بات کا خوف کہ ہماری ہی برادری ہمیں تباہ کر دے گی اور اس تباہی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی کوئی طاقت ہمارے پاس ہو کہ برادری کا دوسرا گروہ ہمیں تباہ نہ کر سکے

لیکن قانون اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جب کوئی چیز وجود میں آجاتی ہے، اس کا استعمال لازمی ہو جاتا ہے۔ یہ جو چالیس ہزار ایٹم بم اور نہیں معلوم کون کون سے بم وجود میں آچکے ہیں ایک روز مزید پھٹیں گے اور دنیا ترقی کے جگمگاتے دھوکے سے آزاد ہو گی تو زمین پر نہ شجر ہو گا، نہ حجر ہو گا اور نہ ہی خوف زدہ انسانوں کی ترقی کا کوئی ثمر ہو گا۔

خوف زدہ زندگی سے باہر آجایئے۔ پھر یہ بربادی کا سامان مہیا کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی اور زمین کی آغوش بھی ویران نہیں ہو گی جس کا ایک ایک ذرہ ہمارے لئے حیات ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اللہ کے دوستوں کو خوف ہوتا ہے اور نہ غم۔"

خوف اور غم کا ہونا دوزخ ہے اور اس سے نجات پا لینا جنّت ہے۔

نئی نسل کے جن پاکیزہ نفس جوانوں نے رمضان المبارک کے احترام میں روزے رکھے اور مساجد میں حضورِ قلب سے عبادت کی، اُن کے اُوپر اللہ کی رحمت عام ہوئی اور وہ رُوحانی فیض سے مستفیض ہوئے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"روزے کی جزا میں خود ہوں۔"

ایسے مقبولِ بارگاہ فیض یافتہ تمام حضرات کی خدمت میں یہ فقیر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

خوب صورت خوب صورت عید کارڈ کے ذریعے محبت کرنے والے خواتین و حضرات نے جس طرح اظہارِ عقیدت کیا ہے اس کے لئے میں انتہائی شکر گزار ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو عام کرنے کے لئے آپس میں متحد رکھ کر اور شیطانی طرزِ فکر "تفرقہ" سے ہماری حفاظت فرمائے، آمین! ●

من موہنی صورت

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ خدا کا بنایا رسُولؐ بادشاہ۔

چند دانشور سر جوڑے بیٹھے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ کشش کیا ہے، کیوں ہے اور اس کا منبع اور مخزن کیا ہے؟

کسی نے کچھ کہا۔ کسی نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے دلائل پیش کئے۔ ایک صاحب بول پڑے:۔

"زمین میں کشش (GRAVITY) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیب زمین پر گر جاتا ہے۔"

دوسرے صاحب بولے:۔

"یہ بھی تو روزمرہ مشاہدے کی بات ہے کہ عارضی طور پر ہی سہی لیکن کششِ ثقل سے آزادی مل جاتی ہے۔ تیز رفتاری بھی کششِ ثقل سے آزاد ہونے کا ایک عمل ہے۔"

شہر سے دُور، آبادی سے باہر ویرانے میں ایک لال بجھکڑ رہتے تھے جب مسئلے کا کوئی حتمی حل سامنے نہیں آیا تو لوگ اس لال بجھکڑ کے پاس پہنچے اور درخواست پیش کی:۔

"حضرت! یہ کشش کیا ہے؟"

لال بجھکڑ غور و فکر کے سمندر میں سے گوہرِ آب دار نکال لائے۔ کہنے لگے:۔

"اس وقت ہمارے سامنے جو بھی شے ہے، وہ خلا ہے۔ بوتل اس لئے بوتل ہے کہ اس کے اندر خلا ہے۔ زمین میں خلا نہ ہو تو بیج کو نشو و نما نہ ہوگی۔ بیج کو خلا سے آزاد

کر دیا جائے (یعنی ڈال بنادی جائے)، تو زندگی در زندگی درخت کا تصور بھی قائم نہیں ہوگا۔"

آدمی بھی خلا ہے اور اس خلا میں لائف اسٹریم گونج (ECHO) رہتی ہے۔

کائنات بھی ایک خلا ہے اور اس خلا کا محور ایک ایسی ذات ہے جو خلا کی رگِ جان ہے۔

جب خلا کے ٹکڑے یک جا ہو جاتے ہیں تو مٹی، لوہا، پتھر، سونا، چاندی بن جاتے ہیں۔

انہیں تقسیم کر دیا جائے تو ناقابلِ تقسیم عدد تک تقسیم ہو جاتے ہیں۔

لال بجھکڑ نے مٹی کا ایک ڈھیلا اُٹھایا۔ اُسے لوگوں کو دکھایا: "صاحبو! یہ ڈھیلا اگر زور سے مارا جائے تو کیا چوٹ لگے گی؟"

لوگوں نے جواب دیا: "جی ہاں، چوٹ لگے گی۔"

لال بجھکڑ نے مٹی کے ڈھیلے کو پیس کر سُرمہ بنایا اور پھونک مار کر اُسے ہوا میں اڑا دیا۔ لوگوں سے پوچھا:۔

"مٹی کا ڈھیلا کہاں ہے؟"

پھر دو سرکنڈے ایک وزن، ایک حجم کے اٹھائے۔ دونوں کو ایک ساتھ فضا میں اُچھال دیا۔ زمین پر دونوں ایک ساتھ نہیں گرے۔ لال بجھکڑ نے کہا: "دوستو! ان دونوں سرکنڈوں کو ایک ساتھ اُچھالا گیا تھا۔ جس فضا میں اُچھالا گیا وہ بھی ایک ہے اور اچھالنے میں جتنی طاقت استعمال ہوئی وہ بھی یکساں ہے۔ پھر یہ سرکنڈے کیوں ایک ساتھ زمین پر نہیں آئے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ شے کے اندر خلا کا عمل رد و بدل ہوتا رہتا ہے۔"

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، خدا کا بنایا رسُولؐ بادشاہ۔

خلا سے اس پار حاکم، قادرِ مطلق ایک شہنشاہ ہے۔ بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا کہ

کوئی ایسا نظام قائم کیا جائے کہ لوگ مجھے پہچانیں۔ خیال کا آنا تھا کہ ارادہ تشکیل پا گیا اور ارادہ 'کُن' بن کر ایسی تصویر بن گیا جس کا ہر ہر عضو ایک مکمل اور مجسم تصویر ہے۔

اسکرین نہ ہو تو تصویر ڈسپلے (DISPLAY) نہیں ہوگی اور خلا نہ ہو تو اسکرین کا تذکرہ نہیں ہوگا۔ یہ جو ذرہ ذرہ خلا ہے، اس لئے ہے کہ اس میں کوئی بستا ہے۔ بادشاہوں کے بادشاہ، اللہ نے اپنی شان کو نمایاں کرنے کے لئے ہر ذرہ کو خلا بنا دیا ہے اور پھر اس میں خود براجمان ہو گیا ہے لیکن ساتھ ہی اپنے اور ذرّے کے درمیان ایک پردہ ڈال دیا ہے۔ ہر چیز پردے کے پیچھے اس من موہنی صورت کے دیدار کے لئے بے قرار ہے اور یہی بے قراری کشش ہے۔ یہ کشش ہی تو ہے کہ آدمی اس کو پانے کے لئے بادشاہتیں چھوڑ دیتا ہے۔ اور یہی وہ کشش ہے جس کو زینہ بنا کر آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں خدوخال (DIMENSIONS) نہیں ہیں۔ یہ کشش ہستیِ مطلق سے جس قدر قریب ہوتی ہے اسی قدر بندہ اللہ کی بادشاہی میں رکن کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس کی سوچ بھی اپنے بادشاہ کی سوچ بن جاتی ہے۔ بادشاہوں کا بادشاہ اللہ خلا، ٹائم، اسپیس کے تانے بانے سے آزاد ہے۔

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، خدا کا بنایا رسولؐ بادشاہ۔

رسول بادشاہؐ نے اللہ کی بادشاہی میں رکن کی حیثیت سے کشش کے اس قانون کو شبِ معراج میں پورا کر دیا ہے، یہاں تک کہ خود اللہ تعالےٰ نے فرمایا :-

"ہم نے اپنے بندے سے رازونیاز کی جو باتیں کیں، کیں۔ دل نے جو دیکھا جھوٹ نہیں دیکھا۔"

●●●

ریشم کا کیڑا

شعوری آنکھ دورِ جدید دیکھتی ہے تو حیران ہو جاتی ہے۔ اُسے انسانی صلاحیتوں اور اس کی اختراعات کا مظاہرہ ششدر کر دیتا ہے۔ زمین یا فضا اس کے دائرۂ بصارت میں آتی ہے تو ایجادات کا ایک لامتناہی سلسلہ سامنے آ جاتا ہے۔ خالقِ کائنات کی تخلیق کی ذیلی صناعی اور تخلیق کے شگوفے دھرتی کے اس کونے سے اُس کونے تک نظر آتے ہیں۔

سڑکوں پر دوڑتی ہوئی گاڑیاں، مزید تیز سفر کے لئے ریل اور فضا کا سینہ چیرتے ہوئے ہوائی جہاز جو ہزاروں ٹن وزن لے کر مہینوں اور سالوں کا سفر گھنٹوں اور دنوں میں طے کر لیتے ہیں۔ اور جن کی رفتار آواز کی رفتار سے بھی زیادہ تیز ہے۔ مواصلاتی نظام جن کے ذریعے ایک جگہ کی آواز اور تصویر کسی قابلِ ذکر وقفہ کے بغیر ایک سرے سے دنیا کے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہے۔ حساب کے پیچیدہ مسائل کے حل کے لئے کمپیوٹر جو کئی کئی دنوں کا حساب منٹوں میں کر دیتے ہیں۔ ایٹم کی قوت کا استعمال اور برقی توانائی کے ذریعے روشنی سے جگمگاتے شہر اور صنعتی اداروں میں گردش کرتے ہوئے پہیئے۔ راکٹ، میزائیل اور ان کی تباہ کاریاں، خلا میں پہنچنے کی پے در پے کوششیں، لیزر شعاعوں کا جادو، برقیات کی حیرت انگیز ترقی، سرجری اور طب کے شعبوں میں آئے دن کی پیش رفتیں۔ یہ وہ ذیلی تخلیقات ہیں جو دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے میں

یکساں متحرک ہیں۔ احسن الخالقین کی بہترین تخلیق، انسان رات دن کی مسلسل اور ان تھک محنت سے اختراعات کا ایک طویل سلسلہ قائم کرنے میں کامیاب تو ہوگیا ہے لیکن اس نے ایجادات و اختراعات کے جال میں اس بات کو تلاش نہیں کیا کہ اگرچہ وہ ان اشیا کا خالق ہے لیکن ان کے درمیان خود اس کی حیثیت کیا ہے۔ فطرت کے قوانین کی تسخیر کا دعویٰ کرنے والے انسان کو یہ نظر نہیں آتا کہ وہ خود اپنی بنائی ہوئی اشیا کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے اور خود اپنے بنائے ہوئے جال میں بے بس مکھی کی طرح ہاتھ پیر مار رہا ہے۔

انسان کی پست ذہنی پرواز اس بات کو محسوس ہی نہیں کرتی کہ اس نے جو کچھ بنایا ہے وہ سب اس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ لیکن وہ ان صلاحیتوں کو محدود رنگ روپ دے کر خود اُن کا غلام بن گیا ہے۔ فضا کا سینہ چیرنے والے ہوائی جہاز کا خالق اپنی تخلیق کو زمین پر کھڑا بے بسی سے دیکھتا ہے، فضا میں اچھلتا ہے تو گیند کی طرح لڑھک کر گر پڑتا ہے۔ کمپیوٹر جیسی حیرت انگیز مشین کو وجود میں لانے والا آدمی دو اور دو چار کے حساب میں اُلجھا رہتا ہے۔ آواز کو ہزاروں میل دُور پہنچانے والے آلات کے موجد کی سماعت کا یہ حال ہے کہ سو دو سو گز دُور کی آواز سننے سے قاصر ہے۔ تصاویر کو ایک شہر سے دوسرے شہر بلکہ فضا سے زمین پر منتقل کرنے والے آلات کے خالق کی بصارت اتنی کمزور ہے کہ کسی دور دراز علاقہ کی بات تو الگ وہ اپنے پیچھے دیکھنے سے معذور ہے۔ مظاہر فطرت کی تسخیر کا دعویٰ کرنے والا آدمی آج اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے اور غیر جانب داری سے جائزہ لے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ فی زمانہ اس کی ذہنی پریشانی، اعصابی کھنچاؤ، بے چینی اور عدم تحفظ کا احساس اپنے عروج پر ہے۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ فاصلوں کی جکڑ بندیوں میں پھنسے ہوئے انسان کے اندر

ایسی صلاحیتیں موجود ہیں کہ زمین کی طنابیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ ایک سیارے سے دوسرے سیارے، ایک نظامِ شمسی سے دوسرے نظامِ شمسی تک کے فاصلے خالقِ کائنات نے اس کو جو بصارت عطا کی ہے وہ مکانی اور زمانی فاصلوں سے ماوراء ہے۔ آدمی کو اس کے بنانے والے نے خلاصۂ کائنات بنا کر اپنی تخلیق کا اعلیٰ ترین نمونہ بنایا ہے لیکن انسان نے خالق کے اس عظیم انعام کی ناقدری کی، اس کا کفران کیا۔ اس نے اپنی صلاحیتوں کو پابند کیا، لامکانی اور لازمانی صفات کو چھوڑ کر چھوٹی اور بہت چھوٹی، حقیر اور بہت حقیر مادیت پر اکتفا کیا اور ریشم کا کیڑا بن کر خود اس میں قید ہوگیا۔ کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات کہ خالق خود اپنی تخلیق کا محتاج ہے۔

آسمانی صحائف میں بتایا گیا ہے کہ وسائل پر حکمرانی یہ ہے کہ ارادہ کے ساتھ وسائل حرکت میں آجاتے ہیں۔ ارادہ کیا ہے؟ ارادہ رُوح کی لامتناہی تخلیقی صفات کا مظاہرہ ہے۔

اپنے اندر رُوحانی صلاحیتوں کو متحرک کرنے اور اُن سے کام لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں کتاب کا علم آتا ہو اور علم کتاب کے وہ فارمولے ہمارے اُوپر منکشف ہوں جن کے اُوپر یہ ساری کائنات ٹھہری ہوئی ہے۔ جب تک یہ علم حاصل نہیں ہوتا آدمی اُدبار کے انبار میں دبا رہے گا۔ مٹی کا خول آدم زاد کا وہ ورثہ ہے جس کے دوش پر بحسرت و یاس ہمارے جدِّ امجد آدم جنّت (اعلیٰ مقام) سے اسفل (زمین) پر پھینک دیئے گئے تھے۔

اے لوگو! دانشورو! کچھ ہوش و خرد سے کام تو لو۔ یہ کیسی ترقی ہے کہ آدمی خود اپنی نسل کو برباد کرنے کے لئے مسلسل کوشاں ہے اور تباہی کا نام اُس نے ترقی رکھ چھوڑا ہے۔ یہ کیسی دانشوری ہے کہ آدم زاد نے ایک ایٹم کی قیمت، لاکھوں آدمیوں سے بڑھا

دی ہے اور ترقی کے خوشنما پردوں میں ذہنی سکون، اطمینان اور تحفظ کے احساس
کو چھپا دیا ہے۔

پرواز

اے آدم زاد! اپنے حافظ کی اسکرین پر پڑے ہوئے پردوں کو چاک کردے اور اندر جھانک۔ کیا تجھ کو وہ سہانا زمانہ یاد نہیں آتا جب تو آزاد فضاؤں میں سانس لیتا تھا، بھوک پیاس کی تکلیف بھی نہ دھوپ تجھے ستاتی تھی، نہ کوئی ڈر تھا نہ پریشانی۔ ملال کیا ہوتا ہے تو اس سے واقف نہ تھا۔ جہاں سے دل چاہے خوش ہو کر کھاتا تھا۔ زمانی و مکانی فاصلے تیرے پیر کی زنجیر نہ تھے۔ خوشی سے سرشار پنچھی کی طرح لامکانی وسعتوں میں تیری پرواز زبان زدِ ملائکہ تھی۔

اے میرے بھائی! ذہن پر ذرا زور تو ڈال۔ کیا تجھے کچھ یاد نہیں، تو نے کیوں اُن سنہری دنوں کی یاد کو فراموش کر دیا ہے؟ ماضی کے تہ خانے میں دفن یہ یادیں کیا تجھے بے چین و بے قرار نہیں کرتیں؟ کسی پُرفضا مقام پر گزارے ہوئے دن یا کسی صحبت میں بیتے ہوئے چند خوبصورت لمحات کو تو ساری عُمر یاد رکھتا ہے لیکن یہ عظیم لمحات کیا تیرے شعور کے دروازے پر کبھی دستک نہیں دیتے؟

اگر تجھے کچھ یاد نہیں آتا، تو سُن، تو نے کفرانِ عظیم کیا۔ تو نے جان بوجھ کر خود کو تکلیف و رنج کے حوالے کر دیا، آزادی کی نعمت کو ٹھکرا کر غلامی کا طوق اپنے گلے میں پہن لیا، پابندیوں کو اپنے پیروں کی بیڑیاں بنا لیا۔ یکسوئی کی جگہ شک اور انتشار کو اپنے اندر جگہ دے دی، آزاد پنچھی ہو کر صیاد کو خود دعوت دی کہ آ، مجھے قید کرے۔ تو نے اپنی لامتناہی

صلاحیتوں کو تناہیت کے اندھیرے غاروں میں دھکیل دیا۔ تیری ان حرکتوں سے آسمان رو رو دیا۔ اور فرشتوں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

اے آدم و حوا کے سپوت! سنبھل، تجزیہ کر اور اپنی حالت کو دیکھ۔ پابندیوں کے جال نے تجھے اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ اب تیرا باہر نکلنا جوئے شیر لانا ہے۔ تجھ پر مصائب کی ایسی یلغار ہے کہ سانس لینا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے تو در بدر مارا مارا پھرتا ہے۔ مستقبل کا خوف تجھے ہر وقت لرزاں رکھتا ہے۔ تو خوشی اور راحت کی ضمانت چاہتا ہے لیکن کہیں سے نہیں ملتی۔

اور دیکھ! تو نے آزادی اور مسرت کی حقیقی قدروں کو سمجھنے کے بجائے جو فرضی قدریں اپنے اوپر مسلط کر لی ہیں، ان کے نتائج اس قدر ہولناک ہیں کہ چند لقموں کے لئے تو اپنے بھائی کی گردن کاٹنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ترقی کے خوش نما لبادوں میں محجوب دھرتی کو تو نے سُرخ خون سے رنگین کر دیا ہے۔ مصائب کے اندھیرے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ روشنی کی کرنیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ تیرے اوپر خود فراموشی کا اتنا غلبہ ہے کہ تو نے اپنی عظمت کو گہنا دیا ہے۔ تو اللہ کا نائب ہے لیکن مادیت اور کثافت نے تجھے لطافت اور پاکیزگی سے محرُوم کر دیا ہے۔

آدم کے بیٹے! تو نے اپنی ابدی اور لافانی زندگی کو تہ در تہ پردوں کے پیچھے چھپا تو لیا ہے اور اُسے اپنے اندر دفن بھی کر دیا ہے لیکن میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا ــــ تجھے جھنجھوڑتا رہوں گا، چاہے تو متوجہ ہو یا نہ ہو۔

قدرت کی فیاضی شاہد ہے کہ اس نے مادی خدوخال سے مرکب اپنے پیغامبر تیرے پاس بھیجے اور تجھے بار بار تیرے وطنِ مالوف کی طرف لوٹنے کی تلقین کی لیکن تو نے

ہمیشہ ناشکری کی۔

اے آدم زاد! میری بات پر دھیان دے۔ میں جو تیرا ضمیر ہوں، تیرے اندر کی آواز ہوں ــــ تیرے باطن کی پکار ہوں۔ دیکھ، میرا گلا نہ گھونٹ، میری طرف متوجہ ہو ورنہ تو اسی طرح مصائب کے اندھیروں میں بھٹکتا پھرے گا۔ اور اندھوں کی طرح ٹھوکریں کھاتا رہے گا۔

اے فرزندِ آدم! اپنے گلے میں پڑے ہوئے غلامی کے طوق کو اتار پھینک۔ زمان و مکان کی مفروضہ پابندیوں کے جال کو کاٹ دے۔ غم و آلام کے بجائے خوشی اور مسرت کا بادہ اوڑھ لے۔ یہ جو تو نے ہزاروں بُت سجا رکھے ہیں اور ان کی بندگی میں مصروف ہے کہ کوئی دولت کا خُدا ہے، کوئی عزت و شہرت کا تو کوئی جھوٹی خواہشات کا خدا ہے۔

آگے بڑھ اور ابراہیمی گُرز سے انہیں پاش پاش کر دے اور آزادی کا مزہ چکھ لے جو تو اپنی غلطی سے کھو بیٹھا ہے۔ اس تیرہ و تاریک عالم سے نظریں ہٹا کر اس روشن دنیا کو بھی دیکھ جہاں ایک آزاد فضا تیری منتظر ہے۔ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے ـ "اے آدم! تو اور تیری بیوی (دونوں) جنت میں سکون کے ساتھ رہو اور جہاں سے دل چاہے، خوش ہو کر کھاؤ۔"

●●●

روشنیوں کا اسراف

یہ بات کون نہیں جانتا کہ کائنات میں موجود ہر شے پیدا ہوتی ہے، نشوونما پاتی ہے، اپنے عروج کو پہنچتی ہے اور پھر اس شے کے انحطاط کا دور آتا ہے اور بتدریج تیزی کے ساتھ یا کچھ زیادہ وقفہ کے بعد وہ شے انجام کار فنا ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی صورت حال آدمی کی بھی ہے۔ آدمی پیدا ہوتا ہے، معصومیت کے دور سے گزر کر شعور کی دنیا میں قدم بڑھاتا ہے اور شعوری زندگی کو معراج سمجھنے والا ذی ہوش، عاقل و بالغ انسان گھٹنا شروع ہوتا ہے اور ایک ایسا دور آتا ہے کہ اعصاب انسانی عمارت کا بوجھ اٹھانے کا خود کو اہل نہیں سمجھتے اور جب انسانی عمارت اینٹ پتھر (ہڈیوں کا پنجر)، چونا اور گارا (اعصاب عضلات)، پلاسٹر (گوشت) اور رنگ و روپ (کھال) اپنی طاقت کھو بیٹھتے ہیں تو یہ عمارت دھڑام سے زمیں بوس ہو جاتی ہے۔

حرکت کے قانون کے مشاہدے سے یہ کلیہ سامنے آتا ہے کہ ہر حرکت کرنے والی چیز میں کوئی چیز ذخیرہ ہوتی ہے اور یہ ذخیرہ جب اس کے اندر جلتا ہے تو یہ چیز حرکت کرتی ہے۔ موٹر کار یا ہوائی جہاز میں پیٹرول جلتا ہے، لالٹین میں کیروسن آئل جلتا ہے، تیز روشن بلب میں بجلی جلتی ہے اور آدمی کے اندر انرجی کیلوریز (CALLORIES) بن کر خرچ ہوتی ہے۔ جتنی زیادہ کیلوریز ذخیرہ ہوتی ہیں، آدمی اسی مناسبت سے زیادہ طاقتور، زیادہ فعال اور زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ کیلوریز میں جس مناسبت سے کمی واقع ہوتی

ہے، اسی مناسبت سے انسانی صحت متاثر ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح ایک گاڑی پیٹرول کی ترسیل نہ ہونے سے جھٹکے کھانے لگتی ہے، آدمی بھی اسی طرح گرتا اور اٹھتا رہتا ہے۔ یہ گرنا اور اٹھنا اس کی اعلیٰ یا اسفل صحت کی نشاندہی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان کے بموجب آدمی کو سڑے ہوئے گارے اور کھنکھناتی مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اس ناقابلِ تذکرہ شے میں اللہ نے اپنی رُوح ڈال دی اور یہ ایک ایسا کھلونا بن گیا کہ سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے، چکھتا بھی ہے اور محسوس بھی کرتا ہے۔ آدمی کا چلنا پھرنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، اختیار استعمال کرنا یہ سب اسی وجہ سے ہے کہ اس کے اندر روشنیاں ذخیرہ کر دی گئی ہیں۔ روشنیوں کا اسراف بے جا اسے جلدی نڈھال کر دیتا ہے اور روشنیوں کا وافر ذخیرہ اُسے زیادہ دیر تک صحت مند اور فعال رکھتا ہے۔ کوئی آدمی جتنا زیادہ دُنیاوی معاملات میں مصروف رہتا ہے اتنا ہی اس کے اندر سکون اور اطمینانِ قلب کم ہوتا ہے۔

دنیاوی آسائش و آرام کی حیثیت اپنی جگہ اہم سہی لیکن قانونِ قدرت یہ ہے کہ جب انسان کسی ایک چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ چیز انسانی دماغ کے اسکرین پر نمودار ہو کر ڈسپلے (DISPLAY) ہوتی ہے اور اس ڈسپلے میں وہ روشنیاں خرچ ہوتی ہیں جو ذخیرہ ہیں اور جس ذخیرے کو انسانی دماغ کے دو کھرب خلیات جنریٹ (GENERATE) کر رہے ہیں۔

اگر ایک گھر کے چار کمروں میں سے ایک کمرے کے اندر دس چیزیں ہیں مثلاً صوفہ سیٹ، ریڈیو، ٹی وی، میز اور دوسرے سامانِ تزئین و آرائش۔ اور دوسرے کمرے میں صرف ایک بیڈ ہے تو کمرے کی دس چیزوں پر جب ہماری نظر جاتی ہے تو ہمارے اندر سے ذخیرہ شدہ روشنیاں ان دس چیزوں کو دماغی اسکرین پر ڈسپلے کرتی ہیں یعنی جو روشنی ایک چیز کے لئے خرچ ہونی چاہئے تھی اس کا خرچ دس گنا بڑھ جاتا ہے۔

عام مشاہدہ یہ ہے کہ سیدھے سادے آدمی کی صحت زیادہ اچھی اور عمر طویل ہوتی ہے جب کہ دنیاوی جھمیلوں میں "بند ذہن" آدمی کی صحت کمزور ہوتی ہے اور اس کی عمر بھی کم ہوتی ہے۔ بات یہی ہے کہ ایک آدمی کے اندر ذخیرہ شدہ روشنیوں کا خرچ کم ہے اور دوسرے آدمی کے اندر روشنیوں کا ذخیرہ شدہ، خرچ زیادہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ زیادہ خرچ کرنے والا آدمی قلاش ہو جاتا ہے۔

روحانی نقطۂ نظر سے جب کوئی بچہ بطنِ مادر سے زمین کی بساط پر آتا ہے تو اس کے اندر پانچ ہزار سال کی عمر گزارنے کے لئے روشنیوں کا ذخیرہ ہوتا ہے جس کو وہ اپنی نادانی، جھوٹے وقار اور خود نمائی کے اعمال سے اتنا زیادہ خرچ کر دیتا ہے کہ پانچ ہزار سال کی عمر پچاس یا ساٹھ سال کی عمر بن جاتی ہے۔ یعنی پانچ ہزار سال زندہ رہنے والا آدمی اپنی عمر کا اسرافِ بے جا کر کے پچاس یا ساٹھ سال میں اُسے ختم کر دیتا ہے۔

قانون یہ ہے کہ مطمئن اور پُرسکون آدمی کی صحت اچھی رہتی ہے، اُسے بھوک خوب لگتی ہے، نیند کی میٹھی آغوش ہمیشہ اس کی منتظر رہتی ہے اور وہ زیادہ دیر زندہ رہتا ہے۔ انتشار اور ذہنی خلفشار میں مبتلا آدمی کے اندر ضرورت سے بہت زیادہ کیلوریز خرچ ہوتی ہیں۔ پیٹ کی آگ اس کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے مگر اس کو بھڑکانے کے لئے اور پھر بجھانے کے لئے اُسے دواؤں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ سوتا تو وہ چاہتا ہے کہ نیند اعصابی توانائی کے لئے بہترین ٹانک (TONIC) ہے مگر نیند اُسے نہیں آتی۔ ہر کسی کی رُوح کی طرح اس کے اندر سے بھی خوشی اُبلنا چاہتی ہے مگر غم و آلام اور کثرتِ سُود و زیاں کے تاثرات یہ خوشی باہر نہیں آنے دیتے اور پھر وہ ایک چہرے پر ملمع شدہ کئی چہرے سجا کر اپنے اندر کا کرب چھپاتا ہے۔ اس کرب میں کیلوریز کا خرچ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور

ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بصد حسرت و یاس خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃ کے مصداق اس عالم کو بے مُراد سدھار جاتا ہے جہاں کاروبار ہے، نہ فیکٹریاں اور نہ عالی شان محلات ——— البتہ اس کے مقدر کا سارا سرمایہ ۶ فٹ × ۲ فٹ کا ایک بے آب و گیاہ گڑھا بن جاتا ہے اور زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ اس دنیا پرست آدمی کے جسم کے ذرّات کو چرند پرند اور عام لوگ پیروں میں روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

●●●

مٹی کا شعور

سوچ کی دو طرزیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک طرز یہ ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے ہم اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہو کر وسائل کے انبار میں خود کو قید کر لیتے ہیں۔ اور ہمارے سامنے آسائش و آرام اور روٹی کپڑے کے علاوہ دوسری کوئی بات نہیں آتی اور اسی کو ہم زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔

دوسری طرز یہ ہے کہ اعتدال کی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ ہم یہ سوچتے ہیں کہ اس مادی دنیا میں ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا ہے۔ دنیا میں عزت و جاہ کا خوش نما لباس زیب تن کرنے کے لئے ہم دولت جمع کرتے ہیں۔ اس دولت کی تشہیر کے لئے عالی شان محلات کھڑے کرتے ہیں۔ گھروں میں تزئین و آرائش کے ایسے ایسے سامان رکھتے ہیں جن سے اس بات کا اظہار ہو کہ ہماری اپنی ایک حیثیت ہے۔

جہاں تک دولت کے انبار جمع کرنے سے عزت و توقیر کے حصول کا تعلق ہے یہ ایک خود فریبی ہے، ایسی خود فریبی جس سے ایک فردِ واحد بھی انکار نہیں کر سکتا۔ فراعین مصر کے محلات، قارون کے خزانے ہمیں بتا رہے ہیں کہ دولت نے کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کی تاریخ خود کو دہراتی رہتی ہے اور ہر زمانے میں دولت کی حقیقت کو ہمارے اوپر آشکار کرتی رہتی ہے۔ بڑے بڑے شہنشاہوں کے حالات سے کون واقف نہیں ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری شان و شوکت اور شاہی دبدبہ کے باوجود مادرِ وطن میں قبر کے لئے جگہ بھی

نصیب نہیں ہوئی ——

سونے چاندی کے ذخیروں اور جواہرات کے ڈھیر نے دنیا کے امیر ترین آدمیوں کے ساتھ کتنی وفا کی ؟ کیا یہ حقیقت ہمارے لئے درسِ عبرت نہیں ہے —؟

مٹی صرف خود کو پہچانتی ہے اور اپنے ایک ایک عضو کو اپنی کوکھ سے وابستہ رکھتی ہے۔ مٹی کو اگر ایک فرد مان لیا جائے تو مٹی سے بنی ہوئی ہر چیز مٹی کے اعضا ہیں۔ تانبا، لوہا، جواہرات، سونا، چاندی وغیرہ مٹی کے وہ اعضا ہیں جن پر مٹی کا تشخص قائم ہے۔ آدمی کا جسم بھی مٹی سے مرکب ہے لیکن آدمی چوں کہ اللہ کی امانت کا امین ہے، اس لئے مٹی کا شعور آدمی کو دوسرے اعضا کے مقابلے میں اپنا قلب سمجھتا ہے اور جب کسی جسم میں قلب متاثر ہو جاتا ہے تو بالآخر جسم مفلوج اور ناکارہ بن جاتا ہے۔ مفلوج اور ناکارہ جسم کی حیثیت زمین پر بوجھ کے سوا کچھ نہیں رہتی۔

یہ بات کس کے علم میں نہیں ہے ؟ آدمی چاہے تو پچاس کمروں کا مکان بنا لے لیکن سوئے گا وہ ایک ہی چارپائی کی جگہ۔ چاہے تو بوریوں میں سونے چاندی (مٹی کے ذرات) سے خزانے بھر لے لیکن پیٹ کے ایندھن کو پورا کرنے کے لئے اُسے دو ہی روٹی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ماحول کو مصنوعی روشنیوں اور خوشبوؤں سے کتنا ہی رنگین اور معطر کر لیا جائے آدمی کے اندر کی سڑاند کا یہ نعم البدل نہیں ہو سکتا۔

زمین کی فطرت ہے کہ وہ اپنی اولاد کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتی ہے اور صاف ستھرا رکھتی ہے اور جب اولاد تعفن سے نکلنا نہیں چاہتی تو وہ اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیتی ہے اور اس ادبار کی وجہ سے آدمی گھناؤنا اور ناسور زدہ ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ کسی بندہ کے لئے اس سے بڑا دردناک عذاب اور کوئی نہیں۔ قرآن کہتا ہے :-

"اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے لئے خرچ نہیں کرتے، اُن کے لئے عَذَابٌ اَلِیْم کی بشارت ہے"

●●●

میٹھی نیند

صدیوں سے زمین پر ہونے والی تبدیلیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ زندگی کے ادوار، زمانہ کے نشیب و فراز اور سائنسی ایجادات زمین کے سینے میں محفوظ ہیں۔ زمین یہ بھی جانتی ہے کہ کتنی تہذیبوں نے اس کی کوکھ سے جنم لیا اور پھر یہ تہذیبیں معدوم ہو گئیں۔

خلا سے اُس پار آسمانوں کی وسعتوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو مایوسیوں، ناکامیوں اور ذہنی افلاس کے سوا ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے کہ زمین کے باسیوں کا اپنی ذات سے فرار اور منفی طرزِ عمل دیکھ کر نیلے پربت پر جھل مل کرتے ستاروں کی شمع امید کی لَو مدھم پڑ گئی ہے۔ وہ انسان جو اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ذہنی اعتبار سے حیوانات سے بدتر زندگی گزار رہا ہے۔ جو سکون ایک بلی اور بکری کو حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی انسان کو میسر نہیں۔

تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والی ہستی، خود مختار خالق نے اس دھرتی کو ایک قطعۂ زراعت بنا کر آدمی کے حوالے کیا ہے کہ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر میٹھی نیند سو سکے۔ اس ہی لئے اس کی تخلیق کا ظاہری جسم اسی مٹی سے بنایا گیا اور اس کے استعمال کی ہر چیز اسی مٹی سے بنائی گئی ہے۔ زمین کو قدرت نے اتنا سخت نہیں بنا دیا کہ آدم زاد اس پر چل نہ سکے، اتنا نرم نہیں بنایا کہ آدم زاد کے پیر زمین میں دھنس جائیں۔ اسے اختیار دیا گیا کہ وہ زمین پر تصرف کر سکے۔ اور زمین کے جسم میں دوڑنے والے خون

(RAYS) سے جس طرح چاہے استفادہ کرے۔ لاکھوں کروڑوں سال پہلے کے آدم کی طرح آج بھی آدم زاد زمین کے سینے پر کھیتی کرنے میں مصروف ہے۔ اس کھیتی کا ہر جزو بھی آدم کی طرح مٹی ہے۔ جو کچھ بوتا ہے اس کا بیج بھی مٹی ہے۔ پودا بھی مٹی کی ایک شکل ہے۔ درخت بھی مٹی کے اجزاء سے مرکب ہے اور یہ جو پُرشکوہ عمارتیں ہمیں نظر آتی ہیں، یہ بھی مٹی ہیں۔ بڑی سے بڑی ایجادات کا بنیادی مسالا (RAW MATERIAL) بھی مٹی ہے۔

آدمی جس طرح سرسبز درخت اور ہرے بھرے لہلہاتے کھیت اُگاتا ہے، اُسی طرح عمارتیں، تعمیرات اور دیگر اشیا بھی اس کی زراعت کی پیداوار ہیں۔
آدمی مٹی بوتا ہے اور مٹی سے ہی نتائج حاصل کرتا ہے۔ بوائی اور کٹائی کا یہ عمل متواتر اور مسلسل جاری ہے کیوں کہ وہ اس زراعت کا فعال رکن ہے اور اسے ارادے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس لئے فصل بھی اسی کے مطابق ہوتی ہے۔ عمل اور ردِ عمل، حرکت اور نتائج کے اس قانون کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔
"دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔"

قول و فعل میں تضاد کا عالم یہ ہے کہ ہر آدمی جانتا اور کہتا ہے کہ زمین پر وقفۂ زندگی محدُود ہے لیکن اس کا عمل اس روزمرّہ مشاہدہ کے خلاف ہے۔ وہ تمام تر زندگی اس طور پر گزارتا ہے جو فطرت کے اٹل قانون کے منافی ہیں۔ تخریب کا نام اس نے ترقی رکھا اور فلاح و بہبُود کے طلسمی نام پر مستقبل کی ناخوش گواریوں کو جنم دیتا ہے۔ روشن نگاہی کا دعویٰ کر کے جو کچھ کرتا ہے وہ بدترین درجہ کی کوتاہ اندیشی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سبحان اللہ! کیا خوب منظر نگاری ہے۔ ایٹم بم کو ترقی کا نام دے کر انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا ڈھنڈورا

پیٹا جا رہا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا فلاح و بہبود کے دعویداروں نے ایک ایٹم بم کو لاکھوں قیمتی جانوں پر فضیلت بخش دی ہے۔ انسان قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں کا امین ہے لیکن اس نے ان صلاحیتوں کو حرص و ہوس، خود غرضی، انا پرستی اور خود نمائی جیسے جذبات کی تسکین میں اپنی ذات تک محدُود عمل کے نتیجے میں آدمی کی ساری توجہ اس فانی دنیا میں مرکوز رہتی ہے۔ اور اس کے اعمال کی بنیاد بھی فانی دنیا کی طرح فنا بن جاتی ہے۔ چنانچہ جب وہ دنیا بوتا ہے تو اُسے دنیا ہی کاٹنا پڑتی ہے۔ چوں کہ دنیا فانی ہے، اس لئے اس کے حصّے میں فنا کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا اور وہ بقا کی زندگی سے جس میں سکون ہے، راحت ہے محرُوم ہو جاتا ہے۔

●●●

دادی امّاں

دادی امّاں اتنی خوبصورت تھیں کہ پورے خاندان میں اُن کی خوبصورتی ضرب المثل تھی۔ اتنی نیک تھیں کہ ان کی نیکی اور پاکیزگی کے چرچے عام تھے۔ اتنی سگھڑ اور سلیقہ شعار تھیں کہ مائیں، اپنی بیٹیوں کو اُن کی نگرانی میں دینا اپنے لئے فخر سمجھتی تھیں۔ میں نے اُنہیں اس وقت دیکھا کہ جب اُن کے مُنہ میں ایک بھی دانت نہیں تھا۔ پوپلے منہ اور چہرہ پر جھریوں کو دیکھ کر ایک گل دستہ کا گمان ہوتا تھا۔ پن کُٹیا میں کوٹ کر پان کھاتی تھیں۔ پان جب رنگ جماتا، چہرہ کی تمام جھُرّیاں رنگ رنگ ہو جاتیں۔ میدہ اور شہد جیسے سفید اور سنہرے رنگ پر یہ سُرخ رنگ ایسا سماں پیدا کرتا کہ دیکھنے والا محوِ حیرت ہو جاتا اور وہ حُسنِ لم یزل کی تعریف میں گم ہو جاتا۔

میں نے شعور کے زینے پر پہلا قدم رکھا تو یہ دیکھا کہ دادی امّاں کی گود میں ہوں اور دادی امّاں اللہ کے کلام کے وِرد میں مگن ہیں۔ یہ بھی دیکھا کہ رات کو سونے سے پہلے کلمۂ شہادت پڑھوایا جاتا ہے اور پھر صبح بیدار ہونے کے وقت لازم تھا کہ آنکھ کھلتے ہی کلمۂ طیبہ پڑھا جائے۔

دادی امّاں کہانیاں بھی سناتی تھیں۔ ہر کہانی کا ایک ہی مفہوم ہوتا تھا کہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، خدا کا بنایا رسولؐ بادشاہ۔ اللہ نے اپنے رسولؐ بادشاہ کے پاس فرشتہ بھیجا اور فرشتہ سے کہلایا۔ "ہمارے پیارے محمدؐ! تم پریشان نہ ہو، تمہارے لئے مکہ کے سارے پہاڑ سونے کے بنا دیتے ہیں۔"

اللہ کے رسول، ہمارے حضورؐ نے کہا: "نہیں، میں اپنے غریب بھائیوں کے ساتھ خوش ہوں۔ مجھے دنیا نہیں چاہیئے۔"

میں نے پوچھا: "امّاں! یہ فرشتہ کیا ہوتا ہے؟"

"بیٹا! فرشتہ بھی ہماری طرح اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق ہے لیکن وہ اچھے اچھے کام کر کے فرشتہ بن گیا ہے۔"

"امّاں! آپ نے فرشتہ دیکھا ہے؟"

"نہیں، میں نے ابھی تک دیکھا تو نہیں لیکن سُنا ہے کہ وہ جگ مگ کرتی روشنیوں سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ جب وہ اُڑتا ہے تو اس کے پروں میں سے چاند، سورج اور ستاروں کی طرح روشنیاں نکلتی ہیں۔"

"امّاں! آپ نے ہمارے حضورؐ کو دیکھا ہے؟"

"ہاں بیٹے، دیکھا ہے، ایک بار۔"

"امّاں! ہمارے حضورؐ کیسے ہیں؟"

"بیٹے، چاند کی طرح ہیں۔ اتنے خوبصورت، اتنے خوبصورت کہ بس اللہ ہی جانے۔"

تمام دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کی تربیت کا پہلا گہوارہ اس کا گھر ہوتا ہے۔ بچہ جو سنتا ہے وہی بولتا ہے، جو دیکھتا ہے وہی اس کا علم بن جاتا ہے۔ آج کے دور میں ہم نہیں دیکھتے کہ دادی امّاں نے کبھی یہ کہا ہو کہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، خدا کا بنایا رسولؐ بادشاہ۔ دن رات گانوں کی آوازیں ہمارے اعصاب پر محیط رہتی ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے کوئی ماں اپنے بچوں کو یہ تلقین نہیں کرتی کہ کلمۂ شہادت پڑھ کے سونا چاہیئے، نہ کوئی باپ اپنی اولاد کو بیدار ہونے کے بعد کلمۂ طیبہ پڑھنے کے لئے کہتا ہے۔ کوئی نہیں

سمجھا تا کہ دولت پرستی نوعِ انسان کی زندگی کے لئے ناسُور (CANCER) ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جن قوموں میں دولت پرستی عام ہوگئی، وہ قومیں صفحۂ ہستی سے مٹادی گئیں۔ قومیں گناہوں سے نیست ونابود نہیں ہوتیں کہ گناہ تو معاف کردیئے جاتے ہیں۔ شرک ایک ایسا گناہ ہے جو کسی صورت معاف نہیں کیا جاتا۔ اور دولت پرستی سب سے بڑا شرک ہے۔ اس شرک کو مہمیز دینے والے بڑے عوامل میں سے ایک بڑا گھناؤنا عمل سُود ہے۔ سود، جو رزق کو حرام کردیتا ہے۔

دادی امّاں اور نانی امّاں اب ہمیں یہ کیوں نہیں بتاتیں کہ حرام رزق کھانے والے کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ حرام روزی کھانے والے کی نماز ہوتی ہے اور نہ اس کا حج ہوتا ہے۔ ہمارے بزرگ اس بات کا رونا روتے رہتے ہیں کہ نوجوان نسل بگڑ گئی ہے۔ اس کے اندر اخلاقی قدریں باقی نہیں رہیں۔ نوجوان نسل میں بزرگوں کا وہ احترام باقی نہیں رہا جو آج سے چالیس سال پہلے تھا۔ لیکن ہم بحیثیت بزرگ کے اپنے گریبانوں میں مُنہ نہیں ڈالتے کہ ہم نے خود اسلاف کے خون سے سینچی ہوئی قدروں کو پامال کردیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ اولاد والدین کے چشم و ابرو کو دیکھ کر کام کرتی تھی۔ اور آج کا زمانہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ اولاد سے والدین ڈرنے لگے ہیں۔

یہ سب اس لئے ہے کہ والدین اولاد کی تربیت ان خطوط پر نہیں کرتے جن خطوط پر ہماری تربیت ہوئی تھی۔ آج کی ماں جب دادی بنتی ہے، اس کے پاس وہ لوری نہیں ہوتی جو بچہ کے شعور کو اللہ اور اس کے رسولؐ سے آشنا کرتی ہے۔ آج کی ماں جب نانی بنتی ہے تو بلاشک وشبہ اس کے اندر وہ قدریں پوری طرح کام نہیں کرتیں جو قرآن و سنت سے ہم آہنگ ہوں جب کہ ہم چاہتے یہ ہیں کہ ہماری نوجوان نسل اسلاف کے نقوشِ قدم

پر اپنی زندگی تعمیر کرے۔ یقیناً یہ طرزِ فکر ایسی دوعملی ہے جس کا نتیجہ خسِرَ الدُّنیَا وَالاٰخِرَۃ کے علاوہ کچھ اور مرتب نہیں ہوتا۔

یاد رکھیے !

قیامت کے روز یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ ہم نے اپنی اولاد کو کس قسم کے کھانے کھلائے ہیں اور کیا لباس پہنایا ہے۔ وہاں پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی اولاد کی تربیت کیسی کی تھی؟ صحیح تربیت کرنے والے والدین سُرخرو ہوں گے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو انعام یافتہ ہیں۔

ننھّی منّی مخلوق

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں ابھی شعور کی اس منزل میں نہیں پہنچا تھا جہاں عقل کی بھٹی میں تپ کر آدمی انسان بن جاتا ہے۔ لیکن یہ سوچ میرے اعصاب کو ہلکان کر رہی تھی کہ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ تفکر کے ڈانڈے زندگی، بندگی سے ہم آغوش ہوتے تھے تو یہ حقیقت سامنے آتی تھی کہ زمین پر پھیلی ہوئی مناعی (مخلوق) کا کائناتی نظام میں ایک قدرِ مشترک رکھتی ہے۔ بھوک پیاس کے تقاضے جس طرح آدمی کے اندر رواں دواں ہیں بالکل اسی طرح دوسری مخلوق بھی ان ہی تقاضوں کی تکمیل میں سرگرداں ہے۔ پیدائش کا عمل چیونٹی کی نوع میں بھی قائم ہے اور آدمی میں بھی۔ بچوں کی نگہداشت اور پرورش کا اہتمام ایک بلی بھی کرتی ہے، ایک چوہا بھی کرتا ہے اور آدمی بھی۔ جہاں تک تربیت کا تعلق ہے ہر نوع ایک مخصوص طرزِ فکر (THOUGHT) میں خود کو پابند کئے ہوئے ہے ——— حصولِ معاش میں صبح دم چڑیا بھی مصروفِ عمل ہو جاتی ہے اور ہاتھی بھی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک گائے کا بچہ مر گیا اور گائے تین دن تک اپنی بڑی بڑی سُرمئی آنکھوں سے آنسو بہاتی رہی۔ یہ منظر بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا کہ ایک گائے تخلیقی عمل کے وقت شدید "دردِ زہ" میں مبتلا ہے اور ولادت ایک مرحلہ بنا ہوا ہے۔ ایک ہندو عورت نے جو ماتا کے جذبات سے سرشار تھی، اعلان کیا:

"گائے کو کمرہ میں بند کر کے دروازہ باہر سے بند کر دیا جائے۔"

کچھ دیر کے بعد کمرہ کھولا گیا تو گائے انتہائی شفقت سے اپنے بچے کو چاٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کی ایسی چمک تھی جو میں نے اپنی ماں کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔ عقدہ یہ کھلا کہ گائے میں بھی شرم و حیا کا تصور موجود ہے۔

کسی صاحب نے آدمیت کا مظاہرہ کر کے ایک کتے کو گولی کا نشانہ بنا دیا تو نہیں معلوم کہاں سے سینکڑوں کتے آموجود ہوئے اور پھر جو انہوں نے بین کرنا شروع کیا تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اور اظہارِ غم کا یہ طریقہ سوئم تک جاری رہا۔

رُوئی کے رنگ رنگ گالوں کی طرح خوبصورت بچوں کے ساتھ مرغی بڑی شان اور پُر وقار انداز میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی کہ چیل کی آواز نے فضا کا سکون درہم برہم کر دیا۔ بچوں کی ماں، مُرغی نے خطرہ محسوس کیا اور اپنی زبان میں بچوں سے کہا: "آؤ، آؤ! چُھپ جاؤ کہ ماں کی آغوش ہی تمہاری جائے پناہ ہے۔"

پھول جیسے من موہنی صورت والے معصوم بچے خوف زدہ ہو کر دوڑے، مُرغی نے اپنے پر پھیلا دیئے اور انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

چڑیا سے بھی ایک بہت چھوٹے پرندے پر نظر پڑی۔ اس کا گھر بھی دیکھا۔ گھر کیا تھا، ایک گنبد نما محفوظ محل تھا ——— الگ الگ کمرے کمروں میں بیڈ روم (BED-ROOM)، بیڈ روم میں روشنی کا انتظام ——— جی ہاں، اس گھر میں جھولا بھی ہے کہ بچوں کے لئے گہوارہ بھی ضروری ہے۔ مضبوط اتنا کہ آندھی طوفان اس کے سامنے بے بس، اندر سے ائرکنڈیشنڈ (AIR-CONDITIONED)۔ معلومات حاصل کرنے پر پتہ چلا کہ یہ گھر 'بیا' کا ہے اور پرندوں میں اس پرندے کا مقام سول انجینئر کا ہے۔ چھوٹا سا پرندہ، جسمانی ساخت میں چڑیا کی طرح، قد و قامت میں چڑیا سے چھوٹا، مگر دماغ ہاتھی سے

زیادہ طاقت ور۔ فنونِ لطیفہ کے ماہر اس پرندہ کے اندر عقل و شعور کا عالم یہ ہے کہ ہلاکت خیز ایجاد، ایٹم بم، کا موجد انسان برسوں بھی ریاضت کرے تو اس قسم کا مکان تعمیر نہیں کر سکتا۔

یہ اور اس قسم کے بے شمار حقائق پر مبنی مشاہدات نے عقل کو مہمیز دی اور نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ عقل کا تعلق ڈیل ڈول سے نہیں ہے اور نہ ہی عقل صرف آدم زاد کی میراث ہے۔

سوچ کے دھارے سمندر بن گئے تو یہ خیال دامن گیر ہوا کہ آدمی اور حیوان میں "حدِ امتیاز" کیا ہے۔ اگر آدمی کا شرف یہ ہے کہ وہ ایجادات کرتا ہے تو ایجادات کا عمل چھوٹے بڑے جانوروں سے بھی سرزد ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ایجادات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے لیکن نوعِ انسان اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی کہ حیوانات کی ایجاد میں ہمیں تخریب کا پہلو نہیں ملتا، جب کہ آدمی کی ایجادات میں تخریب کا عنصر غالب رہتا ہے۔

یہ ایک خبر متواتر ہے کہ آدمی اشرف المخلوقات ہے مگر شرف اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرندہ بغیر وسائل کے پرواز کرتا ہے اور آدمی پرواز کرنے کے لئے اربوں کھربوں ڈالر خرچ کرنے کے باوجود وسائل کا محتاج ہے۔ ترقی و ایجادات کے جتنے شگوفے کھلتے ہیں، اُسی مناسبت سے دکھ اور درد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انتظامی امور پر نظر ڈالئے تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ شہد کی مکھی کا نظم و ضبط انسانی زندگی کے نظم و ضبط سے بہت زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ پھر وہ کون سا شرف ہے جس پر آدم زاد کبر و نخوت کی بھٹی میں سلگ رہا ہے۔ وہ کون سا اعزاز ہے جس نے آدم زاد کو شدّاد، نمرود اور فرعون کے رُوپ میں پیش کیا ہے؟

آج کا دَور ترقی کی معراج کا دَور کہا جاتا ہے۔ اس معراج کا تجزیہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ترقی کے معانی ظلم و ستم کا ختم نہ ہونے والا لامتناہی سلسلہ ہے۔ ترقی یہ ہے کہ بھوکے ننگے انسانوں کو ترقی کا فریب دے کر، ان کے اوپر اپنی علمی برتری کی دہشت بٹھا دی

جائے۔ دھرتی ماتا اپنے بچوں کے لئے جن وسائل کو جنم دیتی ہے انہیں ہڑپ کر کے ہلاکت خیز ہتھیار بنائے جائیں، بھوکے اور افلاس زدہ لوگوں سے کھربوں ڈالر چھین کر ایسا ایٹم بم بنایا جائے جو لاکھوں آدمیوں کو ایک لمحہ میں لقمۂ اجل بنا کر نگل لے۔ اور پھر اس درندگی کی تشہیر کر کے اللہ کی مخلوق کو اس قابل بھی نہ رہنے دیا جائے کہ وہ اپنی بقا کے لئے کچھ سوچ سکے، اپنی نسل کی حفاظت کے لئے کچھ کر سکے۔ بربریت کا یہ عالم ہے کہ خود کو سُپر پاور (SUPER-POWER) ثابت کرنے کے لئے ہتھیاروں کا انبار جمع کر لیا جاتا ہے اور پھر انبار کے اس آتش فشاں سے ایک ماں ایک باپ (آدم و حوّا) کی اولاد، دو بھائیوں کو آپس میں لڑا دیا جاتا ہے، اس لئے کہ دو بھائی یگانگت اور محبت سے رہیں گے تو سُپر پاور بننے کا عمل خواب بن جائے گا۔ کتنا ذہین اور عقلِ کُل ہے دانشور (SCIENTIST) کہ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ جو چیز وجود میں آجاتی ہے اس کا استعمال لازمی ہو جاتا ہے۔ کبھی ہم نے یہ بھی سوچا ہے کہ جنّت نظیر دنیا کے باغات، ہنستے بستے شہروں اور ہرے بھرے کھلیانوں کو سُپر پاور کیوں نیست و نابود کر دینا چاہتی ہے، اس لئے کہ وہ اس بات پر یقین نہیں رکھتی کہ حاکمیت صرف اللہ کی ذات کے لئے مخصوص ہے اور ہم فکر و آلام اور عدمِ تحفظ کی چکی میں اس لئے پس رہے ہیں کہ ہم نے زر پرست اور متعصب لوگوں کو اپنا اَن داتا سمجھ لیا ہے۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم زیادہ نہیں تو کم سے کم اللہ کی ننھی منّی مخلوق کی طرح ہی عقل و شعور سے کام لیں اور اپنے خداوند اللہ کے اس حکم کی پیروی کریں:۔

"اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو"

قیامت گزر جانے سے پہلے ہم نے اگر فطری عقل سے کام نہیں لیا تو صفحۂ ہستی سے

ہمارا وجود حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔

قرآن پاک ببانگِ دُہل یہ اعلان کر رہا ہے:

"جو قومیں خود اپنی تبدیلی نہیں چاہتیں، زمین پر اُن کا وجود خس و خاشاک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔"

●●●

اسرائیل

لبنان کی سرزمین پر موت رقص کناں ہے۔ منافقت کا دیوتا جاگ اُٹھا ہے۔ جبر و استبداد کا دور دورہ ہے۔ معصوم بچوں کے خون سے صحرا کی آبیاری کی جا رہی ہے۔

وسائل سے معمور بڑی بڑی بادشاہتوں کے درمیان چھوٹے سے ملک کے پاس تیس لاکھ اسرائیلیوں نے ظلم و بربریت کا ایسا المناک مظاہرہ کیا ہے کہ مظلوموں کی دلدوز چیخوں، جگر سوز آہ و بکا، نالہ و شیون سے نوّے کروڑ مسلمانوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کے فرستادہ پیغمبروں کی سرزمین ہم سے رُوٹھ گئی اور ہمارے اندر حیا اور شرم کی لالی سے آسمان شفق آلود ہو گیا ہے۔

یہ وہ اسرائیل ہے جس کے بارے میں ہم سنتے آئے ہیں کہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ سے مراد یہودی ہیں۔ بچپن کا وہ زمانہ جو شعور کی سطح پر حافظے کے نام سے نقش ہے، یہ یاد دلا رہا ہے کہ چار کم ساٹھ سال سے ہر مسجد، ہر منبر، ہر مکتب اور وعظ و نصیحت کی ہر محفل میں اپنے مذہبی پیشواؤں کو ہم نے یہ دعا کرتے سنا ہے کہ یا اللہ یہود کو نیست و نابود کر دے اور مسلمانوں کو فتح و کامرانی سے ہمکنار کر۔ آج جب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ بیت المقدس ہم سے چھین لیا گیا ہے، ہیکلِ سلیمانی کے پردے میں اس کی بنیادوں پر کدال چلا دی گئی ہے اور اب جب کہ بیروت جل رہا ہے، وہاں کی مسلم آبادی زہریلے بموں کے نرغے میں موت و زیست کے دروازے پر کھڑی ظلم و ستم کے آہنی پنجے میں سسک رہی

ہے تو یہ کہے بغیر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نوّے کروڑ مسلمانوں کی آدھی صدی سے زیادہ کی دُعائیں بے کار ثابت ہوئیں۔ یہ غلغلہ تو عام ہے کہ بیروت جل رہا ہے، اسرائیل فتح و کامرانی کے نشے میں اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ معصوم نونہال، نرم و نازک صنفِ لطیف خواتین کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ بوڑھے معذور و مفلوج ہو چکے ہیں مگر یہ صدا کسی گوشے سے سنائی نہیں دیتی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور وہ قوم جس سے قدرت نے فتح و نصرت کا وعدہ کیا تھا آج زمین پر بوجھ کیوں بن گئی ہے؟

فتح و نصرت اور کامرانی کی بشارت نبی برحق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی اور حصولِ نصرت کا راستہ بھی متعین کر دیا تھا۔

کیوں ہم نے اپنے دلوں پر مہریں لگالی ہیں اور کیوں ہم نے اپنی آنکھوں پر دبیز پردے ڈال لئے ہیں؟ ہم یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ باعثِ تخلیقِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کے ساتھ دعاؤں کا سہارا لیا ہے۔ مکے کی زندگی میں دعا اور عمل ساتھ ساتھ قائم رہے ہیں۔ یہ وہ ذاتِ اقدس و مکرم و محترم و محتشم ہے جس کے ایک اشارے سے چاند دو لخت ہو گیا تھا۔ یہ رب العالمین کی وہ محبوب ذات ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے راز و نیاز کی باتیں کیں اور اپنی قربت کا وہ اعزاز عطا فرمایا جو نوعِ انسانی میں کسی کو حاصل ہوا اور نہ ہوگا۔ یہ وہی مسجودِ ملائکہ ذات والا تبار ہے جس کے سامنے جبرئیلؑ دو زانو ہو کر بیٹھے ہیں۔ یہی بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر شخص اکبر ہے جس کی امامت میں جلیل القدر پیغمبروں نے نماز ادا کی اور ہر پیغمبر نے آسمانی کتاب میں اس نجات دہندہ کے آنے کی بشارت دی۔

عمل کے بغیر اگر دعاؤں سے کام ہو جاتے تو مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کی کیا ضرورت تھی؟ حضورؐ کا دندانِ مبارک کیوں شہید ہوا؟ حضورؐ نے مدینے سے مکے کی طرف

فوج کشی کیوں کی؟ حضورؐ نے شہری زندگی سے قطع تعلق (BOYCOTT) کیوں منظور فرمایا؟ حضورؐ کی سیرتِ پاک ہمیں بتاتی ہے کہ حضورؐ نے کبھی عمل اور تدبیر کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تدبیر اور عمل کے مثبت نتائج کے لئے دعائیں کیں۔

عمل کے بغیر دعا ایک ایسا جسم ہے جس میں روح نہیں ہے اور جب جسم میں سے روح نکل جاتی ہے تو اس کی حیثیت ایک لاش کی ہوتی ہے جو کسی کام نہیں آتی۔ اسی طرح وہ دُعا جس کے پیچھے عمل نہیں ہوتا قوموں کے لئے اِدبار بن جاتی ہے۔

ہم خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ کیا مسلمان ایسے ہوتے ہیں جس کا مظاہرہ آج ہو رہا ہے؟ جب سے ہوش سنبھالا ہے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم صرف دُعاؤں کے ذریعے اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم عمومی دعائیں اور خصوصی دعائیں بھی مانگتے ہیں۔ آدھی صدی سے زیادہ کا زمانہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے من حیث القوم کافروں کے اوپر فتح و کامرانی کی کوئی دُعا قبول ہوتے نہیں دیکھی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

دُعائیں اس لئے قبول نہیں ہوتیں کہ ان کے ساتھ عمل نہیں ہے اور تخلیق کا راز یہ ہے کہ عمل بجائے خود تخلیق ہے۔ ہم اپنی معاش کے لئے دھوپ کی تپش میں سرگرداں رہتے ہیں اور سردی کی یخ بستہ راتوں میں اپنی نیندیں خراب کرتے ہیں۔ افزائشِ نسل کے لئے شادیاں کرتے ہیں۔ جب دُعائیں توپ و تفنگ، میزائل، راکٹ اور بم بن کر اسرائیل کو تباہ کر سکتی ہیں تو زندگی کے ان سب ہنگاموں کی کیا ضرورت ہے؟ کسان کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ زمین کے سینے کو چیر کر اس سے غذائی ضروریات پوری کرے؟ دھوپ کی تمازت اور ژالہ باری سے بچنے کے لئے آخر ہم مکان کیوں بناتے ہیں؟ جب عمل کے بغیر دُعا سے ہر کام ہو سکتا ہے تو ہم زندگی سے متعلق معاملات میں جدوجہد اور

کوشش کرنے کی بجائے مانگ لیا کریں ـــــ یا اللہ! ہمیں اولاد دے، یا اللہ! ہمارا مکان بنادے، یا اللہ! ہم سے محنت مزدوری نہیں ہوتی ہمارے مُنہ میں روٹی کے لقمے ڈال دے۔

آخر یہ کس قسم کا مذاق ہے کہ جب انفرادی زندگی زیرِ بحث آتی ہے تو ہمارا عضو عضو مصروفِ عمل ہو جاتا ہے اور جب اجتماعی زندگی درپیش ہوتی ہے تو ہم دُعا کے لئے ہاتھ باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر صرف دُعا ہی سے کافر جہنّم رسید ہو جاتے تو جہاد کس لئے فرض کیا گیا؟

یاد رکھئے! جو لوگ صرف دعائیں کراتے ہیں اور دعاؤں کے ساتھ عملی اقدامات کا مظاہرہ نہیں کرتے وہ ہرگز قوم کے دوست نہیں۔ بزعمِ خود یہ وہ نادان دوست ہیں جن کی تدبیریں ہمیشہ رُسوا اور ذلیل کرتی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ بے عملی قوم کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے اور ہر فرد اپنی ذات میں بند ہو جاتا ہے۔ بے عمل بندہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب بھی ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ سے اللہ کی رسّی چھوٹ جاتی ہے اور سیسہ پلائی ہوئی قومی دیوار میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ عمل سے جی چراتے والی قومیں ناکارہ، مفلوج اور مغضوب بن جاتی ہیں۔

کوئی ہے ـــ ـــ جو اس زہرناک طرزِ عمل سے قوم کو آگاہ کرے؟ کوئی ہے ـــــ جو عالمِ اسلام کو یہ بتائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی عمل اور عمل سے عبارت ہے: خالقِ کائنات نے اس کائنات کو متحرک اور فعّال بنایا ہے۔ چاند، سُورج، ستارے، زمین، آسمان، فرشتے، ہر چیز اور ہر مخلوق مسلسل حرکت میں ہے۔ اللہ کے فرستادہ پیغمبروں اور اس راہ پر چلنے والے تمام اولیاء اللہ نے

ہمیشہ عمل کی تلقین کی ہے اور بے عملی سے اجتناب کی نصیحت کی ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جب سے ہم نے عمل کو ترک کیا ہے اور صرف دعاؤں کا سہارا لینا شروع کیا ہے، ہمارے اندر سے نور نکل گیا ہے اور نار نے ہمیں اپنا لقمۂ تر سمجھ لیا ہے۔

اے واعظو! اے منبر نشینو! اے قوم کے دانشورو! برائے خدا، سوتی قوم کو جگاؤ اور بتاؤ کہ بے عمل قومیں غلام بن جاتی ہیں۔

●●●

کفرانِ نعمت

برگد کے دو پتے میز پر میرے سامنے پڑے ہیں۔ ظاہری آنکھ کو ایک رنگ، ایک جسامت اور ایک ہی طرح کے نقش و نگار نظر آتے ہیں بالکل اس طرح جس طرح چار ارب آدمیوں کے ہاتھ ایک جیسے نظر آتے ہیں لیکن جب ہم ہاتھ کے اوپر ماضی و حال کی تحریر پڑھتے ہیں تو ہر ہاتھ ایک نئی دنیا کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ آبادی کے انگوٹھوں کی لکیریں ہمارے اوپر چار ارب انفرادی ذہن کا انکشاف کرتی ہیں اور ہر انکشاف ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

جس طرح ایک باپ کی اولاد مختلف رنگ و روپ اور مختلف خدوخال کی حامل ہوتی ہیں، اسی طرح ایک درخت کے لاکھوں پتے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ہر پتے کے اندر نقش و نگار ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ کسی درخت کے دو پتے سامنے رکھ کر تجربہ توکیجئے۔

درخت بھی آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ اچھے یا بُرے کردار کے لوگوں سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ درختوں کے اوپر مدھم یا تیز موسیقی بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اب یہ بات بھی پردہ نہیں رہی کہ انسان کے اندر ہمہ وقت دو حواس کام کرتے ہیں۔ حواس کی ایک طرز ہمیں زمان و مکان میں قید رکھتی ہے اور دوسری طرز میں ہمارے اوپر سے زمان و مکان (TIME & SPACE) کی حد بندیاں ختم ہو جاتی ہیں اور انسان خلا کے اُس پار آباد

دُنیاؤں کا مشاہدہ کرلیتا ہے۔ کائنات کی ہر مخلوق میں حواس کی یہ دونوں طرزیں سرگرم عمل ہیں یعنی ہر مخلوق میں چھٹی حس موجود ہے۔

پتے کے اندر چھٹی حس یا باطنی نگاہ نے مجھے جب اپنے اندر تفکر کرتے دیکھا تو پتہ یوں گویا ہوا: "اے آدم زاد! میں نے اپنے اسلاف (درختوں) سے سنا ہے کہ آدم اشرف المخلوقات ہے۔ اُسے قدرت کا ایک مخصوص انعام حاصل ہے، ایسا انعام جس سے اللہ کی دوسری مخلوق محروم ہے اور یہ محرومی اُس کی خود ساختہ ہے"۔

کائنات کی تخلیق کے بعد خالق اکبر نے زمین و آسمان میں تمام مخلوقات کو اپنا امین بنانا چاہا تو اللہ تعالےٰ نے سماوی مخلوق اور ارضی مخلوق کو مخاطب کرکے فرمایا: "ہے کوئی جو ہماری امانت کو اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھائے"۔

سماوی و ارضی مخلوق نے یک زبان ہو کر عرض کیا: "بارالٰہا! ہم بہت کمزور اور ناتواں ہیں۔ ہم اس کے اہل نہیں ہیں"۔ لیکن آدم نے بغیر سوچے سمجھے اس امانت کو اپنے کاندھے پر اٹھالیا۔ آج وہی آدم جو آسمانوں اور زمین میں تمام مخلوق سے معزز قرار دیا گیا ہے مصائب اور آلام میں سسک رہا ہے اور خود اپنا دشمن بن گیا ہے۔

درخت جب آپس میں اس اعزاز کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو آدم زاد کی اس جہالت پر خوب ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ آدم جو خود کو ہم سب سے بہت زیادہ باشعور سمجھتا ہے، احمق ترین مخلوق ہے۔ ہمارے اسلاف آدم کے اسلاف سے زیادہ ہوشیار اور عقلمند تھے کہ انہوں نے یہ جان لیا تھا کہ اللہ کی امانت قبول کرکے اس کی حفاظت نہ کرنا اور اس سے فائدہ نہ اُٹھانا کفرانِ نعمت ہے۔ جب کہ کفرانِ نعمت ناشکری ہے اور ایسی قومیں جو شکرگزار نہیں ہوتیں، صفحۂ ہستی پر بوجھ بن جاتی ہیں۔ آسمانی بلائیں ان کی زندگی کو زہر یلا کر دیتی

ہیں۔ ایسی قوموں کی عزتِ نفس داغ دار ہو جاتی ہے، ایسی قومیں ذلت و رُسوائی اور شکست کی علامت بن جاتی ہیں۔

برگد کے پتے کی زبانی عقل و شعور کی باتیں سُن کر میں استغراق کے دریا میں ڈوب گیا۔ زبان کو یارا نہ رہا کہ کچھ عرضِ حال کرے۔ دماغی کمپیوٹر میں کام کرنے والے پارہ کھرب کل پُرزے (CELLS) ساکت و جامد ہو گئے۔ آنکھوں میں روشنی دُھندلا گئی کہ فہم و فراست کا مشاہدہ کر سکے۔

بالآخر میں احمقانہ سوال کر بیٹھا۔ "کیا درختوں میں بھی اسی طرح عقل کام کرتی ہے جس طرح آدم زاد عقل سے آراستہ ہے؟"

دونوں پتے کھُد بُد ہنسے اور ایک طنزیہ قہقہہ لگا کر بولے: "کسی چیز کا انکار یا اقرار ہی عقل و شعور کا ثبوت ہے۔ اگر ہمارے اسلاف میں عقل نہ ہوتی تو وہ کہتے کہ ہم اس امانت کے متحمل نہیں ہیں۔

"درندگی، خوں ریزی، قتل و غارت گری، تعصب، بددیانتی، خود غرضی اور حق تلفی پر مشتمل زمین کی کوکھ سے جنم لینے والی لاکھوں سال کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہم انسان کے مقابلے میں زیادہ سمجھ دار اور باشعور ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آدم زاد سے زیادہ پست عقل کوئی دوسری مخلوق نہیں۔ کیا یہ اپنے اوپر نادانی اور ظلم نہیں ہے کہ گھر میں غذا کا انبار لگا ہوا ہے اور آدمی فاقے کر رہا ہے۔ کیا یہ جہالت نہیں ہے کہ ساری کائنات آدم کے لئے مسخر کر دی گئی ہے اور آدم زاد قید و بند کی زندگی میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ آدم زاد اپنے اندر کی روشنی سے دنیا میں روشنی پھیلانے کے بجائے ساری دنیا کو اندھیر کر دینا چاہتا ہے۔"

برگد کے درخت کے پتوں کی زبانی یہ مکالمہ سُن کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ جگر خون اور دل پاش پاش ہو گیا۔ ایک آہ نکلی اور کانوں میں یہ آواز گونجی:

"کاش میں درخت کا ایک پتہ ہوتا جس پر شبنم موتی بن کر استراحت کرتی اور پرندے شاخوں پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے۔ صبح دم پرندوں کے یہ ترانے میری رُوح میں ایسی سرشاری پیدا کر دیتے کہ میں آسمان کی وسعتوں میں گم ہو کر اشرف المخلوقات ہونے کا اعزاز واپس لے آتا!"

●●●

عورت

جب کسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے تفکر کے ڈانڈے ملائے جاتے ہیں تو بہت سی ایسی باتیں شعور کی سطح پر اُبھر آتی ہیں کہ جن کا تجزیہ اگر کیا جائے تو بہت تلخ حقائق منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے ہر چیز جوڑے جوڑے بنائی ہے۔ مذہبی حلقہ کہتا ہے کہ عورت کو مرد کی اُداسی کم کرنے اور اس کا دل خوش کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

عفّت و عصمت کا تذکرہ آتا ہے تو وہاں صرف اور صرف عورت زیرِ بحث آتی ہے۔ کیا مرد کو عفّت و عصمت کے جوہر کی ضرورت نہیں ہے؟ عورت کے تقدّس کو یہ کہہ کر پامال کیا جاتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔ عقل و شعور سے اُسے کوئی واسطہ نہیں۔ علم و ہنر کے شعبے میں اب تک عورت کو عضوِ معطّل بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ دانشور، واعظ، گدّی نشین حضرات کچھ ایسے تاثرات بیان کرتے ہیں کہ جن سے عورت کا وجود، بہرحال، مرد سے کمتر ظاہر ہوتا ہے۔

یہ عورت وہ عورت ہے جس کے خون کا ایک ایک قطرہ مرد کا ایک ایک عضو بن جاتا ہے۔ یہ وہ عورت ہے جو اپنے اندر موجود تخلیقی فارمولوں سے دماغ کے بارہ کھرب خلیوں کو جنم دیتی ہے۔ یہ وہ عورت ہے جو نو مہینے اپنے پیٹ میں بچّہ کی نشو و نما کے لئے دن رات ایک کر دیتی ہے۔ یہ وہ عورت ہے جو مرد کی رُوح کے لئے زندگی میں کام آنیوالی

انرجی (ENERGY) کے تانے بانے سے جسمانی خدوخال کا لباس تیار کرتی ہے۔ یہ وہ عورت ہے جو دو سال تک اپنا خونِ جگر بچّہ کے اندر انڈیلتی رہتی ہے۔ یہ کیسی بدنصیبی اور ناشکری ہے کہ وہی مرد جس کی رگ رگ میں عورت کی زندگی منتقل ہوتی رہتی ہے، مرد کی تفریح کا ذریعہ بھی جاتی ہے۔ بے رُوح معاشرہ نے عورت کو مرد کے مقابلے میں ایسا کردار بنا دیا ہے جس کو دیکھ کر ندامت سے گردن جھک جاتی ہے۔ ناطقہ سر بہ گریباں ہے کہ مرد نے عورت کو ایک اشتہاری چیز بنا دیا ہے۔ سڑکوں پر آویزاں بورڈوں پر، اخباروں میں، ضروریاتِ زندگی کی اشیاء کے پیکٹوں پر، انتہا یہ کہ گندگی اور غلاظت صاف کرنے والے ٹین کے سربند ڈبّوں پر بھی ہمیں عورت کی تصویر نظر آتی ہے۔ اُف! کتنی بے حُرمتی ہے اس ہستی کی جس نے اپنا سب کچھ بیچ کر مرد کو پروان چڑھایا ہے۔

بلاشبہ یہ کھلی ناانصافی اور احسان فراموشی ہے۔ ناشکری اور ناانصافی کا ردِّ عمل اس قدر بھیانک اور الم ناک ہوتا ہے کہ تاریخ اس سے لرزہ براندام ہے۔ دنیاوی علوم سے آراستہ دانشوروں کا یہ وطیرہ کم عقلی پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رُوحانی علوم کے لامتناہی میدان میں بھی عورتوں کو نظر انداز کیا گیا تو اعصاب پر موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سینکڑوں سال کی تاریخ میں مشہور و معروف اولیاء اللہ کی فہرست پر نظر ڈالئے تو صرف ایک عورت کی نشاندہی ہوتی ہے اور اُسے بھی آدھا قلندر کہہ کر اُس کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ کیا عورت اور مرد کے اندر الگ الگ رُوحیں کام کرتی ہیں؟ کیا رُوح میں تخصیص کی جا سکتی ہے؟ کیا رُوح بھی کمزور اور ضعیف ہوتی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو عورت کی رُوحانی اقدار کو کیوں محجوب رکھا گیا ہے؟ مردوں کی طرح ان خواتین کا تذکرہ کیوں نہیں کیا گیا جو اللہ کی دوست ہیں؟

وہ کون سی ایسی صفت ہے جو سورۂ احزاب کی ۳۵ ویں آیت میں مردوں کے لئے گنوائی گئی ہے اور عورتوں کو اس سے محروم رکھا گیا ہے ؟ اللہ تعالیٰ مرد اور عورتوں کی یکساں صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

تحقیق مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور قرآن پڑھنے والے اور قرآن پڑھنے والیاں اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیاں اور صبر کرنے والے اور صبر کرنے والیاں اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرتے والیاں اور خیرات دینے والے اور خیرات دینے والیاں اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں اور نگہبانی کرنے والے شرم گاہ اپنی کی اور نگہبانی کرنے والیاں اور یاد کرنے والے اللہ کو بہت اور یاد کرنے والیاں تیار کیا ہے اللہ نے واسطے اُن کے بخشش اور ثواب بڑا۔ (قرآن)

اسلام شرف کا علم بردار ہے۔ اس نے سارے انسانوں کو واجب عزت قرار دیا ہے۔ پھر عورت مرد کی تخصیص کن مصلحتوں اور کن مفروضہ تاویلوں کی نشاندہی کرتی ہے؟ ــــ جو فرد، جو قوم اپنی ماں، اپنی بہن، اپنی بیٹی، اپنی شریکِ حیات کی عزت و تکریم کو کم کرتی ہے وہ ذلیل و خوار ہو جاتی ہے۔

آج من حیث القوم مسلمان کو جس ذلت اور مسکنت کے گہرے غار میں دفن کیا جا رہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہی بے انصافی ہے۔

اے میری ماں! میری بہن! میری لختِ جگر بیٹی! تم اور مرد ایک اللہ کی تخلیق ہو۔ تمہارے اور مرد کے اندر ایک اللہ کی رُوح ہے۔ تمہارے اندر بھی وہ تمام صلاحیتیں

اور صفات موجود ہیں جو قدرت نے مرد کو ودیعت کی ہیں ــــ جب ایک عورت رابعہ بصری بن سکتی ہے تو دنیا کی تمام عورتیں اپنے اندر اللہ کی دی ہوئی رُوحانی صلاحیتوں کو بیدار کر کے اپنے نام اولیاء اللہ کی فہرست میں ثبت کرا سکتی ہیں۔

وہ زمانہ آگیا ہے ــــ کہ خواتین بھی مردوں کی طرح رُوحانی فیوض سے دنیا کو روشن اور منور کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کا انعام عام ہے۔ آیئے آگے بڑھیں اور صراطِ مستقیم پر چل کر اپنی رُوحانی طاقت سے، نوعِ انسانی کے اُوپر سے شیطانی غلبہ کو ختم کر دیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آغوشِ رحمت آپ کی منتظر ہے۔

●●●

لہریں

ایک سادھو، خواجہ غریب نوازؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سادھو گیان دھیان سے اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں گوشت پوست کا جسم مٹی نظر آتا ہے، ایسی مٹی جس میں خمیر تعفن بن جاتا ہے۔ اور جب انسانی نظر میں گوشت پوست مٹی کے ذرات میں تحلیل ہونے لگتا ہے تو اُسے آدمی کے اوپر ایک اور آدمی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ آدمی ایسا نظر آتا ہے جیسے ٹیلی ویژن کی اسکرین (SCREEN) پر متحرک تصویر۔ یہی وہ آدمی ہے جسے سائنس AURA کہتی ہے۔

AURA کیا ہے؟

ہم جب کپڑے کی ساخت کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ کپڑا دھاگے کے تانے بانے سے تیار ہوتا ہے۔ اس تانے بانے سے بنے ہوئے کپڑے کے اوپر نقش و نگار بھی بنائے جاتے ہیں، ایسے نقش و نگار جو کپڑے کے ساتھ یکجان ہو جاتے ہیں۔ جب روشنیوں کے تانے بانے پر انسانی نقش و نگار بُن دیئے جاتے ہیں تو اس کا نام AURA ہے کیوں کہ روشنی کے اوپر وقت کی گرفت نہیں ہوتی اس لئے وہ زمان و مکان کی پابندی سے آزاد ہوتی ہے۔ زمان و مکان سے آزادی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی نظر آسمانی وسعتوں کو چھو لیتی ہے۔ پھر نظر کی گہرائی اتنی ہو جاتی ہے کہ آدمی وہ کچھ دیکھنے لگتا ہے جو گوشت پوست کی آنکھ سے نظر نہیں آتا۔

مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر ہر شخص اپنی اصل یعنی AURA سے وقوف حاصل کر سکتا ہے۔ AURA کوئی ایسی ماورائی چیز نہیں ہے جو شعور کے دائرے میں نہ آئے۔ روشنیوں کے جن تاروں سے AURA بنا ہوا ہے ان تاروں کے اندر دوڑنے والی ELECTRICITY سے ہر شخص اختیاری اور غیر اختیاری طور پر متعارف ہے اور اس ELECTRICITY کے فنکشن (FUNCTION) سے ہر آدمی متاثر ہوتا رہتا ہے۔ کچھ عرصے دُور رہنے کے بعد جب اپنے لختِ جگر کو سینے سے لگاتا ہے تو سینے کے اندر غیر مرئی لہریں منتقل ہوتی ہیں۔ اور یہ لہریں (WAVES) تاربرقی نظام کے تحت روشنی کے تانے بانے کو اپنی گزرگاہ بناتی ہوئی جب دماغ میں پہنچتی ہیں تو ایک سرُور کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات بھی ہمارے مشاہدے میں ہے کہ دو دل جب ایک دوسرے میں جذب ہونا چاہتے ہیں اور جذب ہونے میں خاندانی رسم و رواج، اخلاقی اور معاشرتی قدریں دیوار بنتی ہیں تو ایک فرد جب دوسرے فرد کو ہاتھ لگاتا ہے تو اس کو کرنٹ لگتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق میاں بیوی جب ہم لباس ہوتے ہیں تو جسم کے روئیں روئیں سے لہریں نکلتی ہیں اور یہ لہریں ایک نئی تخلیق کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔

آدمی جب اپنے AURA (ELECTRICITY) سے وقوف حاصل کر لیتا ہے تو اس کی رفتار بجلی کی رفتار کے برابر ہو جاتی ہے اور کوئی بندہ اس رفتار سے نہ صرف یہ کہ محوِ پرواز ہو جاتا ہے بلکہ ہزاروں لاکھوں سال پہلے یا بعد کی باتیں اس کے سامنے آجاتی ہیں۔

سادھو نے خواجہ غریب نوازؒ کی طرف گہری نظر ڈالی اور اُس کی نیم وا آنکھیں

اُن پر جم گئیں۔ وہ برملا پکار اُٹھا۔

"پربھو، دھن دھن قدرت تیری !

جے جے ایشور کی کرپا ہے۔

اے خواجہ! تیری آتما روشن ہے لیکن دل میں ایک سیاہ دھبہ ہے۔"

حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے سادھو کی بات سن کر فرمایا: "تو سچ کہتا ہے۔"

سادھو یہ سن کر حیرت کے دریا میں ڈوب گیا اور کہا: "چاند کی طرح روشن آتما پر یہ دھبہ اچھا نہیں لگتا۔ کیا میری شکتی سے یہ دھبہ دور ہو سکتا ہے؟"

خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے جواباً کہا: "ہاں، تو چاہے تو یہ سیاہی دُھل سکتی ہے۔"

سادھو کے اوپر اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی۔ نم آنکھوں اور کپکپاتے ہونٹوں سے اس نے کہا: "میری زندگی آپ کی نذر ہے۔"

خواجہ صاحبؒ نے فرمایا: "اگر تو اللہ کے رسول محمدؐ پر ایمان لے آئے تو یہ دھبہ ختم ہو جائے گا۔"

سادھو کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی لیکن چوں کہ وہ اپنے اندر مٹی کی کثافت دھو چکا تھا، اس لئے وہ اللہ کے دوست محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لے آیا۔

خواجہ صاحبؒ نے فرمایا: "آتما کی آنکھ سے دوبارہ دیکھو۔"

سادھو نے دیکھا تو روشن روشن دل سیاہ دھبے سے پاک تھا۔ سادھو نے خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے آگے ہاتھ جوڑ کر بنتی کی۔

"اس انہونی بات پر سے پردہ اٹھایئے ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔"

خواجہ صاحبؒ نے کہا: "سن، وہ روشن آدمی جس کے دل پر تو نے سیاہ دھبہ دیکھا تھا تو خود تھا لیکن اتنی شکتی کے بعد بھی تجھے رُوحانی علم حاصل نہیں ہوا۔"

"رُوحانی علم یہ ہے کہ ہر آدمی کا دل آئینہ ہوتا ہے اور ہر دوسرے آدمی کے آئینے میں اُسے اپنا عکس نظر آتا ہے۔ تو نے جب اپنی روشن آتما میرے اندر دیکھی تو تجھے اپنا عکس نظر آیا۔ تیرا ایمان توحید پر نہیں تھا، اس لئے تیرے دل پر سیاہ دھبہ تھا اور جب تو نے کلمہ پڑھ لیا۔ وہ سیاہ دھبہ دھل گیا اور تجھے میرے آئینے میں اپنا عکس روشن اور منور نظر آیا۔"

●●●

قیامت

رات کے دو بج کر دو منٹ دو سیکنڈ گزرنے پر شعور کی سطح پر یہ خیال اُبھرا کہ ــــــ گھنٹے، دن، مہینے، سال اور صدیاں کیا ہیں؟ اگر ان کی کوئی حقیقت ہے تو گزرا ہوا وقت کہاں چلا جاتا ہے؟

عام مشاہدہ بھی یہ ہے کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو واپس نہیں آتا۔ مرنے کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ وقت کی زنجیروں میں سے ایک کڑی نکل گئی، اس طرح نکل گئی کہ پھر اُسے زنجیر قبول نہیں کرتی یا وہ کڑی وقت کی زنجیر سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے۔

خاندان کے افراد کی طرح شب و روز اور ماہ و سال کو وقت کی ذریت سمجھ لیا جائے تو اس کے علاوہ ہرگز کوئی بات اپنے اندر وزن نہیں رکھتی کہ لمحات پر موت وارد ہوتی ہے تو منٹ کی تخلیق ہوتی ہے اور جب منٹ اور گھنٹے موت کی وادی میں سفر کرتے ہیں تو شب و روز کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔ رات اور دن جب لقمۂ اجل بن جاتے ہیں تو وقت کی کوکھ ماہ و سال کو جنم دیتی ہے۔ مہینے اور سال عمرِ طبعی کو پہنچتے ہیں تو صدیوں کی پیدائش عمل میں آتی ہے ــــــ ایک آدمی کے مرنے کے بعد کسی طرح بھی کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں گیا۔ وقت کے بارے میں بھی ہمارے لبوں پر مُہرِ سکوت لگی ہوئی ہے۔

شماریات کا تعلق بھی وقت کے ساتھ براہِ راست ہے اس لئے زندگی بجائے خود شماریات کے تانے بانے پر رواں دواں ہے۔ پیدائش سے مرنے دم تک ہم شماریات

کے مختلف خانوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت تک ہم گونگے بہرے ہیں جب تک ایک اور دو کے مفروضہ تعین کو تسلیم نہ کریں۔ ایک اس لئے ایک ہے کہ ہمیں بتا دیا گیا ہے کہ ایک ہے۔ دو اس لئے دو ہے کہ خبرِ متواتر کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ لازم کر دیا گیا ہے کہ ہم دو کو دو کہیں۔ نوعِ انسانی اس مفروضہ ورثے کے جوئے کو اپنے کاندھوں سے اتار کر پھینک دے تو حساب و کتاب کے سارے فارمولے زمیں دوز ہو جائیں گے۔

آدم زاد کی ذاتی اور صفاتی حیثیت کا تعین اس کے نام سے ہوتا ہے۔ نام بھی جب اپنی جگہ ہمیں منجمد نظر آتا ہے تو ہمارے اوپر حیرت کے باب کھل جاتے ہیں۔ چند گھنٹوں کی جان کا جو نام رکھ دیا جاتا ہے وہ زندگی بھر ہر ہر لمحہ بدلتے ہوئے اعضائے جسمانی کے ساتھ اس طرح چپکا رہتا ہے کہ کسی طرح اس سے فرار ممکن نہیں۔ یہ کیسی نادانی، کم فہمی اور بے عقلی ہے کہ ایک دن کا بچہ وقت اور زمانے کی چکی میں پس کر ساٹھ سال میں سر سے پیر تک تبدیل ہو جاتا ہے مگر نام وہی رہتا ہے جو پیدائش کے وقت رکھا گیا تھا۔

بات اختیار کی آتی ہے تو مجبوری کا یہ عالم کہ آدم زاد کو خود پیدائش پر اختیار نہیں ہے۔ سونا، جاگنا، کھانا، پینا، بڑھنا، گھٹنا آدمی کا اپنا اختیاری نہیں ہے مگر آدم زاد پھر بھی بااختیار ہے! کوئی فردِ واحد مرنا نہیں چاہتا مگر مرنا ایک لازمی امر ہے، کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔

ایک مخصوص نظام کے تحت سورج نکلتا ہے، غروب ہو جاتا ہے۔ دھوپ دھرتی کو انرجی (ENERGY) فراہم کرتی ہے، ہوا تیز اور سبک چلتی ہے اور چلتی رہتی ہے تخلیق کے اندر آٹومیٹک مشین (AUTOMATIC MACHINE) کے ذریعے ہوا جسم میں دوڑنے والے خون کو زندگی عطا کرتی ہے لیکن اس پر بھی ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے۔

اس لئے کہ سانس بھی ہمارا اختیاری نہیں ہے۔

آئیے اس مسئلہ کو الہامی طرزوں میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"جہاں تم ایک ہو وہاں دوسرا اللہ ہے، جہاں تم دو ہو وہاں تیسرا اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ رگِ جان سے زیادہ قریب ہے۔ اللہ ابتدا ہے، اللہ انتہا ہے، اللہ ظاہر ہے، اللہ باطن ہے، اللہ ہر چیز پر محیط ہے"

شعور ہمیں بتاتا ہے کہ پہاڑ انتہائی درجہ سخت، ٹھوس اور جمی ہوئی شے کا نام ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"تم گمان کرتے ہو کہ پہاڑ جمے ہوئے ہیں حالاں کہ یہ بادلوں کی طرح اُڑ رہے ہیں"

جب ہم قیامت کا تذکرہ کرتے ہیں تو لاکھوں کروڑوں سال کا ماضی اس کے ساتھ ہمیں نظر آتا ہے مگر قرآن فرماتا ہے:

"جتنی دیر پلک جھپکنے میں لگتی ہے، قیامت کا وقفہ اس سے بھی کم ہے"

اے میرے بھائیو، میرے بزرگو، میری ماؤ، بہنو اور بیٹیو! کیا ہم یہ سوچنے پر مجبور نہیں ہیں کہ یہ سب کیا ہے، کیوں ہے؟

●●●

محبوب

ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب گلشنِ زندگی پر خزاں کا پہرہ تھا۔ ہر طرف سکوت و انجماد تھا۔ وقت، حرکت اور بے چینی ایک دوسرے سے ناآشنا تھے۔ مشیتِ خداوندی نے چاہا کہ تنہائی ختم ہو اور سکوت حرکت میں تبدیل ہو جائے۔ مخلوقات کا ظہور ہو تاکہ اس کی قدرت اور ربوبیت کا مظاہرہ ہو۔ اور مخلوق اس کی عظمت، حکمت اور صناعی کو دیکھے اور اس کو پہچانے۔ مشیت کا ارادہ صدائے کُن بن کر گونجا۔ زندگی نے انگڑائی لی اور حرکت کا آغاز ہوا۔ مشیتِ الٰہی کی اسی چاہت اور خواہش کو حدیثِ قدسی نے اِن الفاظ میں ڈھال دیا ہے کہ

میں چھپا ہوا خزانہ تھا پس میں نے مخلوق کو محبت کے ساتھ تخلیق کیا تاکہ میں پہچانا جاؤں۔

مشیت نے اپنے پروگرام کے مطابق سب سے پہلے ایک ایسا میڈیم تخلیق کیا جو کائنات اور خالق کے درمیان واسطہ اور رابطہ ہو اور تعارف اور شناسائی اور تعارف اور روشناسی کا منشا پورا کر سکے۔ درمیانی واسطہ موجود نہ ہو تو کائنات کا نحیف و نزار پیکر صفتِ جلال سے راکھ ہو جائے۔

جب یہ میڈیم یا نُور پیکرِ بشری میں متشکل ہوا تو ذاتِ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنا۔ مخلوق کو خالق سے متعارف کرانے کا سلسلہ آدم سے شروع ہو کر انسانِ کامل پر ختم

ہوگیا۔ مقامِ محمود اور مقامِ محبوبیت عطا کرکے آپؐ کے اور رفعتوں کا قربِ حق میں اہتمام
کردیا گیا۔ وہاں پہنچایا گیا جہاں دو کمانوں سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ اس جامع کمالات وصفات
ہستی نے جس طرح مشیت کا منشا پورا کیا اور جس طرح مخلوق پر رحمتِ خداوندی نچھاور کی
اس کی تعریف و توصیف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"بے شک اللہ اور اس کے ملائکہ اس نبیؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اے
ایمان والو! تم بھی درود و سلام بھیجو۔"

عرفان و گیان کی دنیا کے ماہِ کامل نے نوعِ انساں کو یاد دلایا کہ انسان کا
تخلیقی رشتہ اللہ رب العزت سے وابستہ ہے۔ اس رشتہ کو فراموش کرکے کوئی بندہ
سکون و اطمینان حاصل نہیں کرسکتا۔ انسانوں کے انسانوں پر حقوق ہوں یا انسان کا کائنات
سے تعلق یہ سب ایک ہی بنیاد پر ہیں اور وہ یہ کہ ہمارا اور سب چیزوں کا مالک اللہ
ہے۔ اُس نے ہمیں اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم اس کو پہچانیں۔

خاتم النبیینؐ نے یہ حرفِ راز بتایا کہ بندہ خالق کو اسی وقت پہچان سکتا ہے
جب اس کا ہر عمل صرف اور صرف اللہ کے لئے ہو۔ جب بندے کی ذاتی غرض درمیان
میں نہیں رہتی تو بندے اور خالق کا وہ رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ آقائے دوجہاں نے
معاشرت، معیشت، جنگ، امن غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اس ابدی راز کی عملی تفسیر
پیش کی ہے کہ

"میری نماز، میرا جینا، میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔"

مسلمان قوم کا یہ اعزاز ہے کہ اس قوم کو نورِ اوّل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی
نسبت حاصل ہے۔ ہر سال ربیع الاوّل کا مہینہ آتا ہے۔ زمین سے آسمانی رفعتوں تک

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی صدا بلند ہوتی ہے۔ ہر اسٹیج، ہر جلسہ گاہ میں آپؐ کا
ذکرِ پاک کیا جاتا ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ صرف آپؐ کا نام لینے سے اور آپؐ کے
ذکر کا غلغلہ بلند کرلینے سے آپؐ کے روحانی مشن میں کتنی پیش رفت ہوئی ہے۔

ماہ ربیع الاوّل بے شک اللہ تعالیٰ کی اس نعمتِ عظیم کی یادگار ہے جو اس نے
محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ساری نوعِ انسانی کو عطا کی ہے۔ لیکن یہ
مہینہ ہمیں اس طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ ہم اپنے اندر جھانک کر دیکھیں، اپنے باطن کا تجزیہ
کریں کہ کیا ہمارا اپنے رب سے اسی طرح کا رشتہ قائم ہے جس تعلق کا عملی نمونہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے؟

ہمیں اپنے اندر، باہر، ظاہر، باطن ہر طرف نظر دوڑا کر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہم کس
حد تک خود فریبی میں مبتلا ہوچکے ہیں۔ ہمارے نفس نے ہمیں اپنے رب سے دور تو نہیں
کردیا؟ ایسا تو نہیں ہے کہ دوسروں کو نصیحت کے عمل نے ہمیں خود اپنے آپ سے بے خبر
کردیا ہے۔

خاتم النبیینؐ، دوجگ کے تاجدار، رحمت للعالمین کے اسوۂ حسنہ کو اپنے اوپر
محیط کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حضورؐ نے جس طرح زندگی گزاری ہے ہم بھی اس کا
عملی مظاہرہ کریں۔

ہمیں یہ دیکھنا ہوگا۔ باوجود اس کے کہ حضورؐ دونوں جہاں کے خزانوں کے مالک
تھے، کس طرح زندگی گزارتے تھے۔ اپنے مفید مطلب زندگی کے کسی ایک شعبہ پر عمل
کرلینے سے ہرگز تعمیلِ ارشاد کا منشا پورا نہیں ہوتا۔

اللہ میاں

جب سے نوعِ انسانی نے زمین پر آنکھ کھولی ہے لاکھوں اربوں آدم زاد اس زمین سے اُبھرے اور جب ان کی روحوں نے جسموں سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا، اس دھرتی نے ان کے خاکی جسموں کو خاص و عام کی تخصیص کے بغیر اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ کیا بادشاہ، کیا فقیر سب سطحِ زمین کے نیچے جا چھپے۔

اسی زمین کے ایک شہر لاہور میں جہاں ایک طرف ملکہ نور جہاں فرشِ خاک کے نیچے موجود ہے وہاں دوسری طرف داتا گنج بخش ہجویریؒ بھی محوِ استراحت ہیں۔ نور جہاں کی قبر پر جائیے تو وہاں افسردگی اور ویرانی کا راج ہے۔ لوگ وہاں جاتے ہیں تو تفریح و دلچسپی کے لئے۔ یہ وہ نور جہاں ہے جو ایک زمانے میں ہندوستان کے سیاہ و سپید کی مالک تھی۔ اس کے برعکس داتا گنج بخشؒ کا مزار ذکر و سلام کی آوازوں سے گونجتا ہے وہاں عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کئے جاتے ہیں۔ حالاں کہ داتا صاحب اپنی زندگی میں نہ کسی دنیاوی حکومت کے مالک تھے نہ آپ کے پاس مال و زر کا کوئی ڈھیر تھا۔

ایسا کیوں ہے؟

اس لئے کہ جو شخص اپنے اندر موجود اس روح سے واقف ہو جاتا ہے جو اُبدیت کا پرتو اور صفاتِ الٰہیہ کا مظہر ہے تو زمان و مکان اس پر اپنا پہرہ نہیں بٹھا سکتے۔ مٹی کی چپک (GRAVITY) اس کو قید نہیں کر سکتی۔ وہ ہر زمانے میں زندہ و پائندہ رہتا ہے

جب وہ دنیا میں ہوتا ہے تو اس کے پاس عرفان کی دولت کے سوا کچھ نہیں ہوتا لیکن لوگ اس کی طرف کھنچ کھنچ کر آتے ہیں۔ اور جب وہ اس دنیا سے پردہ کر لیتا ہے تو مخلوق پروانے کی طرح اس کے مرقد کے گرد طواف کرتی ہے۔ ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ ایسے ہی پاکیزہ نفس بندوں کے سرگروہ اور سرخیل ہیں۔

انبیائے کرام کی شخصیات دراصل ایک طرزِ فکر سے عبارت تھیں۔ نبوت کا یہ سلسلہ خاتم النبیین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ختم ہو گیا لیکن کیوں کہ اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ تعطل، اس لئے ہر زمانے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرزِ فکر اور ان کے علوم کے وارث ایسے بندے پیدا ہوتے رہے تاکہ نور و ظلمت کا توازن قائم رہے اور نوعِ انسانی اس طرزِ فکر سے روشناس ہو جائے جو اُسے خوف اور غم سے نجات دلاتی ہے۔

مینارۂ نورِ ہدایت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وارث قلندر بابا اولیاؒ نے اپنے پیچھے فکر کی وہ روشنی چھوڑی ہے جس کی رہنمائی میں آج کی پریشان ذہن اور پراگندہ دل نسل اپنے مستقبل کو سنوار سکتی ہے۔ آج نوعِ انسانی جس ذہنی کشاکش اور دماغی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر انبیا کی طرزِ فکر کا انعکاس کم سے کم ہوتا جا رہا ہے اور اس کے اپنے بنائے ہوئے مفروضہ حواس نے اُسے حقیقت آگاہی سے محروم کر دیا ہے۔

قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں:

انبیائے کرام جب کسی چیز کے متعلق سوچتے تو اس چیز کے اور اپنے درمیان کوئی رشتہ براہِ راست قائم نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ ان کی طرزِ فکر یہ ہوتی تھی کہ کائنات کی

تمام چیزوں کا اور ہمارا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ کسی چیز کا رشتہ ہم سے براہِ راست نہیں ہے بلکہ ہم سے ہر چیز کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ جب وہ کسی چیز کی طرف مخاطب ہوتے تھے تو اس چیز کی طرف خیال جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف خیال جاتا تھا۔ انہیں کسی چیز کی طرف توجہ دینے سے پیشتر یہ احساس عادتاً ہوتا تھا کہ یہ چیز ہم سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اس چیز کا اور ہمارا واسطہ محض اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہے۔ جب ان کی طرزِ فکر یہ ہوتی تھی تو ان کے ذہن کی ہر حرکت میں پہلے اللہ تعالیٰ کا احساس ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی بحیثیت محسوس کے ان کا مخاطب اور مدِ نظر قرار پاتا تھا اور قانون کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی صفات ہی ان کا احساس بنتی تھیں۔ اور ان کا ذہن اللہ تعالیٰ کی صفات کا قائم مقام بن جاتا تھا۔"

اس اجمال کی تفصیل میں آپ نے فرمایا :

"اگر ہم کسی شخص سے قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی وہی کرنا ہوگا جو ہمارا مطلوب کرتا ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ سے دوستی اور قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی وہی کرنا ہوگا جو اللہ تعالیٰ کرتے ہیں۔"

باباصاحبؒ سے عرض کیا گیا: "حضور! اللہ میاں بھی کوئی کام کرتے ہیں اور اگر کرتے ہیں تو کیا بندہ وہ کام کرسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کرتے ہیں؟"

فرمایا: "اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر آن اپنی مخلوق کی خدمت میں مشغول ہیں۔ مخلوق کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کی زندگی کے لئے وسائل فراہم کرتے ہیں لیکن اس معاملے میں مخلوق سے کوئی صلہ یا بدلہ نہیں چاہتے۔ بندہ اگرچہ خالق کی سطح پر مخلوق کی خدمت نہیں کرسکتا لیکن اپنی سکت، صلاحیت اور بساط کے مطابق کسی صلے یا بدلے کے بغیر وہ اللہ کی مخلوق

کی خدمت کرسکتا ہے۔ وہ مخلوق ہوتے ہوئے وسائل کی احتیاج سے ماورا نہیں ہوسکتا لیکن اپنی ہر حاجت اور ضرورت کو اللہ تعالیٰ کی ذات اکبر سے وابستہ کرسکتا ہے۔ اس طرزِ عمل کی وجہ سے وہ اللہ کی بادشاہت کا ایک رُکن بن جاتا ہے۔"

مزید فرمایا :

"ہر کام پوری جدوجہد اور کوشش سے کیا جائے لیکن نتائج کو اللہ تعالیٰ کے اوپر چھوڑ دیا جائے۔"

باباصاحبؒ نے نوعِ انسان کو یاد دلایا کہ :

"تسخیرِ کائنات اور جنّت کی زندگی اس کا ورثہ ہے لیکن اس ورثہ کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ انسان اس صلاحیت سے متعارف ہو جو جنّت کی زندگی میں اسے حاصل تھی۔ اس صلاحیت کا حصول رُوح سے قریب ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ جو شخص اپنے INNER سے واقفیت حاصل کرلیتا ہے وہ ابدی سکون و راحت کو پالیتا ہے۔"

●●●

تاج الدّین باباؒ

چوپائے کسی کی نوکری نہیں کرتے اور پرندے دکانیں نہیں سجاتے۔ لیکن زندگی گزارنے کے تمام وسائل انہیں قدرت مہیا کر دیتی ہے۔

چوپائے ہوں یا پرندے ان کی معاش، معاشرتی زندگی کا تجزیہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ بھی جذبات واحساسات کے تانے بانے میں بُنے ہوئے ہیں۔ جنس، غصہ، مادری محبت، پدری شفقت ان کے اندر بھی موجود ہے۔ پرندوں کو اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر بھی دامن گیر رہتی ہے۔ بچے جب زندگی گزارنے کے لئے تعلیم وتربیت کا دور پورا کر لیتے ہیں تو ماں باپ اپنا گھر (گھونسلا) بچوں کے سپرد کر کے پرواز کر جاتے ہیں۔ اور اپنے لئے ایک ایک تنکا جمع کر کے نیا گھر تعمیر کرتے ہیں۔

چرندے ہوں، درندے ہوں یا پرندے، وہ عقل وشعور بھی رکھتے ہیں۔ حشرات الارض (کیڑے مکوڑے) یہ جانتے ہیں کہ ضروریات پوری کرنے کے لئے پیشگی انتظام نہیں کیا گیا تو ہماری نسل باقی نہیں رہے گی۔ خطۂ ارض پر ایسے چوپائے بھی موجود ہیں جن میں مستقبل بینی کی صلاحیت عام آدمیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ بلی اور کتے کو آنے والی مصیبتوں اور بلاؤں کی یلغار کا پہلے سے پتہ چل جاتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اور حیوان میں فرق کیا ہے؟ آدمی اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ آدمی بھی چوپایوں کی طرح دو پیروں سے چلنے والا جانور ہے۔ بصیرت سے

دیکھا جائے تو آدمی حیوانات سے ہر لحاظ سے کم تر ہے۔ جتنا یقین ایک چڑیا کو اپنے خالق کے اوپر ہے آدمی کے اندر اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ جتنا استغنا ایک چیونٹی کو ہے آدمی اس سے محروم ہے۔ جو کردار آدمی کو حیوانات سے ممتاز کرتا ہے وہ فکر وشعور کے دائرے میں رہتے ہوئے خالقِ حقیقی سے رابطہ ہے۔ اگر کسی بندہ کا اپنے خالق سے ربط نہیں ہے تو وہ دراصل دو پیروں سے چلنے والا جانور ہے۔ ایک جانور چار پیروں سے چلنے والا ہے، دوسرا دو پیروں سے چلنے والا ہے۔ اُڑنے والا جانور اور تیرنے والا جانور بھی چار پیروں سے چلنے والے جانوروں میں شامل ہے، اس لئے کہ وہ پَر بھی استعمال کرتا ہے اور پیر بھی۔ نیز اس کے انڈے کی صورت وہی ہوتی ہے جو چار پیروں سے چلنے والے جانور کی ہوتی ہے۔

حیوانات کی نوعوں میں سے دوسری نوعوں کی طرح ایک نوع آدمی بھی ہے لیکن جب کسی بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے تو وہ جانوروں کے گروہ سے نکل کر انسان بن جاتا ہے اور انسانوں کی فکر وفہم یہ ہوتی ہے کہ وہ برملا پکار اُٹھتے ہیں کہ ہمارا جینا، ہمارا مرنا سب اللہ کی طرف سے ہے اور اس کی یقینی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ہمیں پیدا کیا تھا تو پوچھ کر پیدا نہیں کیا تھا۔ دنیا میں ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں ہے جو اپنی مرضی سے پیدا ہوا ہو یا اپنی مرضی سے ہمیشہ زندہ رہے۔ ہم ان ہی وسائل سے استفادہ کرتے ہیں جو ہمارے لئے پہلے سے تخلیق کر دیئے گئے ہیں۔ اس نکتہ کو حضرت بابا تاج الدّین ناگپوریؒ نے اپنے ایک دوہے میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

اجگر کریں نہ چاکری پنچھی کریں نہ کام[1]
داس ملوکا کہہ گئے سب کے داتا رام

[1] نہ چوپائے نہ پرندے

●●●

چڑیا گھر

کراچی کے چڑیا گھر میں شیرنی کے نومولود بچوں کو دیکھنے کے لئے ایک ہجوم جمع ہے۔ ننھے ننھے بچے رنگ رنگ لباس پہنے ہوئے شیرنی کے پنجرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور شیرنی کے بچوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ شیرنی ماستا کے ساتھ اپنے بچوں کے قریب بیٹھی ہوئی اپنے بچوں کی طرح آدم کے بچوں کو بھی شفقت کی نظر سے دیکھ رہی ہے۔ کبھی کبھی اپنے بچوں کی شرارت کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتی ہے اور انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں منع کرتی ہے۔ لیکن بچے ہیں کہ شرارت سے باز نہیں آتے۔ اور شیر کے بچوں کی شرارت، اچھل کود سامنے کھڑے ہوئے آدم زاد بچوں کے لئے تفریح کا سامان فراہم کر رہی ہے ـــــ ذرا دور، شیر بھی باوقار انداز میں ٹہل رہا ہے۔ وہ بھی بردباری کے ساتھ اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش تو ہو رہا ہے لیکن چہرے سے کوئی خاص تاثر قائم نہیں ہونے دیتا۔ ویسے نگرانی پوری اور سخت ہے ـــــ

میری اچٹتی ہوئی نظر جنگل کے بادشاہ شیر پر پڑی تو میں اس کی آنکھوں میں سحر اور چمک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ شیر کی آنکھوں سے میری آنکھیں چار ہوئیں تو مجھے محسوس ہوا کہ شیر کے دماغ میں خیالات بننے والی لہریں آنکھوں کے ذریعے شیر کی آنکھوں کے اندرونی عضلات (MUSCLES) سے ٹکرا رہی ہیں اور پھر یہ لہریں میرے دماغ کی اسکرین پر منعکس ہو کر کوئی پیغام دے رہی ہیں۔

اس صورت حال سے میں پہلے تو گھبرا گیا کہ کہیں شیر بھی کوئی پیغام دے سکتا ہے۔ یہ بے زبان درندہ مجھ جیسے اشرف المخلوقات سے کیا کہہ سکتا ہے ؟

جیسے ہی ذہن میں یہ خیال آیا کہ شیر درندہ ہے، شیر کی مخمور آنکھوں میں خمار کے طوفان امڈ کر آئے ہوئے اور نشریات کا دباؤ اتنا زیادہ ہو گیا کہ میں شیر کی گفتگو سننے پر مجبور ہو گیا۔ شیر مجھ سے ٹیلی پیتھی کے طریقے پر گفتگو کر رہا تھا۔

اس نے طنز بھرے لہجے میں کہا :-

اے آدم زاد! تو مجھے درندہ کہتا ہے۔ درندگی کی تعریف یہی تو ہے کہ میں اپنے سے کمزور جانوروں کا شکار کر کے اپنا پیٹ بھرتا ہوں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ شیر گوشت کھائے تو وہ درندہ ہے اور آدمی جو اپنا شوق پورا کرنے کے لئے چھوٹی سے چھوٹی چڑیا کو بندوق سے شکار کرتا ہے اور گوشت کھاتا ہے۔ درندہ نہیں ہے۔

شیر کی یہ بات سن کر میرا شعور لرزنے لگا۔ میں نے بہت چاہا کہ تاویل میں شیر سے کچھ کہوں مگر میرا سارا علم اور اشرف المخلوقات ہونے کا سارا غرور سر کے بل آ رہا۔ اب میں شیر کی آنکھوں میں سے نکلنے والی لہروں سے راہ فرار اختیار کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ میرے اوپر شیر کے بچوں کی ماں نے اپنی نظریں گاڑ دیں اور یوں گویا ہوئی :-

اے آدم زاد !

تو کس برتے پر اکڑتا ہے ؟ دیکھ، میری طرف دیکھ ! مجھ سے آنکھیں نہ چرا، میں مؤنث ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے اوپر جنس مسلط نہیں رہتی۔ ہم اس کو تفریح طبع کے لئے استعمال نہیں کرتے بلکہ قانون قدرت کے تخلیقی نظام میں اپنا کردار پورا کرنے کے لئے یہ عمل انجام دیتے ہیں۔

اے اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرنے والے!

ذرا سُن ـــــ یہاں کچھ دن پہلے تیری نوع کا ایک آدمی آیا تھا۔ یہ جو میرا شوہر ہے نا، یہ ذرا فلسفی اور منطقی مزاج رکھتا ہے۔ بیٹھے بٹھائے اُسے کیا سوجھی کہ اُس آدم زاد سے اُلجھ پڑا اور کہنے لگا کہ میں تجھ سے زیادہ زور آور ہوں۔

آدمی نے کہا: "نہیں۔ میں تجھ سے زیادہ زور آور ہوں"

میرے شوہر نے اس کی دلیل مانگی تو آدمی نے اپنی جیب سے ایک فوٹو نکال کر اُسے دکھایا۔ اس تصویر میں آدمی شیر کے اوپر بیٹھا ہوا تھا۔

شیر نے کچھ دیر غور کیا۔ پھر اس آدمی سے پوچھا: "یہ تصویر کس نے بنائی ہے؟"

آدم زاد نے جواب دیا: "یہ تصویر آدمی نے بنائی ہے"

شیر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا جس سے سارا چڑیا گھر زیر و زبر ہوتا ہوا محسوس ہوا پھر شیر نے کہا: "اے آدم زاد! تو کتنا بے وقوف اور جاہل ہے کہ اتنی سی بات بھی تیرے شعور میں نہیں آئی ـــــ اگر یہ تصویر کسی شیر نے بنائی ہوتی تو شیر اوپر ہوتا اور آدمی نیچے ہوتا"

بچوں کی اُچھل کود اور آس پاس کے شور و شغب نے شیرنی سے میرا رابطہ توڑ دیا۔ اور کچھ نہ سوچنے کے ارادے کے باوجود بہت کچھ سوچتے ہوئے چڑیا گھر سے واپس آگیا۔

●●●

پیوند کاری

ہوا یوں کہ رات کے وقت سوتے سوتے اچانک آنکھ کھلی تو تجربہ میں یہ بات آئی کہ سو کر اُٹھنے کے بعد دماغ خالی خالی رہتا ہے۔ جب تک پلکوں کی جنبش بار بار آنکھ کے ڈیلوں کو مضروب نہ کرے، دماغ میں کوئی خیال نہیں آتا۔ کیوں کہ آنکھ اچانک کھلی تھی، اس لئے پلکوں کی جنبش میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ جتنی تاخیر ہوئی اسی مناسبت سے دماغ خالی رہا۔ شعوری طور پر دماغ خالی تھا لیکن لاشعور کی جھلک دماغ کی اسکرین (SCREEN) پر کچھ اس طرح پڑی کہ پہلے ایک چکا چوند سی ہوئی۔ پھر اس چکا چوند میں ایک رال کا گولا سا پھٹا۔ یہ رال کا گولا کیا ہے؟ اس کا مشاہدہ میں نے سنہ ۶۵ء اور سنہ ۷۱ء کی جنگ میں کیا تھا۔ جب ریڈار (RADAR) کے اوپر تصویر منعکس ہوتی ہے کہ ہوائی جہاز حملہ کرنے والے ہیں تو آسمان کے اوپر آسمان کو روشن کرنے کے لئے گولے پھینکے جاتے ہیں اور یہ گولے نہایت سفید روشنی سے فضا کو روشن اور منور کر دیتے ہیں۔ یہ گولے دراصل رال کے ہوتے ہیں۔

مرکری (MURCURY) روشنی جب دماغ میں سے پھوٹی تو اندر کی آنکھ نے یہ دیکھا کہ تخلیق ڈائیوں (DYES) میں ہو رہی ہے۔ یعنی کائنات میں موجود جتنی اشیاء ہیں، ان سب کے لئے ایک ایک ڈائی (DYE) مخصوص ہے۔ جس طرح چڑیا کی ڈائی میں پلاسٹک ڈال کر چڑیا بنالی جاتی ہے اور کبوتر کی ڈائی میں بھی پلاسٹک ڈال کر کبوتر بنا لیا

جاتا ہے۔ اسی طرح قدرت کی بنائی ہوئی ڈائیوں میں مصالحہ (MATTER) ایک خاص طریقۂ کار (PROCESS) سے منتقل ہوتا رہتا ہے اور نئی نئی صورتیں وجود میں آتی رہتی ہیں۔

تخلیق کرنے والی ایک واحد ہستی ہے جس نے ایک دوسری ہستی کو تخلیق کرنے کی صلاحیتوں سے نوازا ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ ناقابلِ تردید ہے کہ یہ جو دوسری ہستی ہے، تخلیق میں وہی چیزیں یا وہی عناصر یا وہی موجود MATTER استعمال کرنے پر مجبور ہے جو پہلی واحد اور یکتا ہستی نے بنا دی ہیں۔

اس دوسری ہستی کا نام انسان ہے۔ انسان جب بھی کوئی نئی چیز وجود میں لاتا ہے یا تخلیق کرتا ہے تو اس ذیلی تخلیق میں کسی نہ کسی صورت میں اللہ کی بنائی ہوئی اشیا کا دخل ہوتا ہے۔ یعنی اللہ کی تخلیق سے ذیلی تخلیقات عمل میں آتی ہیں۔ جب وہ تخلیقات آپس میں ایک دوسرے کے اندر جذب ہوتی ہیں یا جذب کر دی جاتی ہیں تو نتیجے میں تیسری شے وجود میں آجاتی ہے۔ مثلاً تخلیق کا ایک مظہر پانی ہے۔ اور تخلیق کا دوسرا مظہر مٹھاس ہے۔ مٹھاس اور پانی کو باہم دگر ملا دیا جائے تو شربت بن جاتا ہے۔

دو تخلیقات میں پیوندکاری کر کے تیسری چیز بھی بنائی جاتی ہے۔ جانوروں میں پیوندکاری سے خچر کا وجود سامنے آتا ہے۔ آم کے درختوں میں پیوندکاری ہوتی ہے تو آم کی بے شمار قسمیں بن جاتی ہیں۔ علیٰ ہٰذالقیاس اس قسم کی پیوندکاری کا ایک نظام ہے جو دنیا میں جاری و ساری ہے۔ اس پیوندکاری کے شعبے پر نظر ڈالی جائے تو دیکھا یہ جاتا ہے کہ پیوندکاری کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تخلیق، انسان کے اندر نمایاں طور پر موجود ہے۔ کسی انسان اور درخت یا کسی انسان اور جانور میں یہ حدِ فاصل قائم ہے کہ انسان

پیوندکاری کر سکتا ہے لیکن درخت پیوندکاری نہیں کر سکتے۔

جو لوگ نظر کے قانون سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب رُوح کی آنکھ وا ہوتی ہے تو فاصلے معدوم ہو جاتے ہیں۔ لاکھوں سال کا وقفہ سیکنڈوں میں سمٹ جاتا ہے۔ آدم سے لے کر موجودہ سائنسی دَور تک تمام ارتقائی مراحل فلم کی طرح سامنے سے گزر جاتے ہیں۔

غاروں، پتھروں اور دھات کے دَور سے نکل کر نظر نے موجودہ سائنسی زمانہ کا احاطہ کیا تو یہ دیکھ کر اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی کہ انسان نے جن ارتقائی مراحل کا نام ترقی رکھا ہے وہ دراصل ترقی نہیں ہے۔ ترقی کا محور انسانی فلاح و بہبود نہیں بلکہ ہلاکت ہے۔ اس ہلاکت خیز ترقی کے پس منظر میں کوئی معقول جواز بھی نہیں ہے۔ صرف دولت کے انبار جمع کرنا ہے اور جب نظر یہاں ٹھہری کہ انسان انسان کی پیوندکاری (TEST TUBE BABY) میں بھی مصروف ہیں تو ظلم و جہالت کی گھٹائیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ تحت الشعور نے بتایا کہ ناشکرے انسان نے اپنی حیثیت کم کر کے خود کو درختوں کی صف میں شامل کر لیا ہے۔

درخت قدرت کی ایسی تخلیق ہیں جو ایندھن بنتے ہیں۔ مطلب یہ نکلا کہ زمین کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ انسان کو ایندھن کے طور پر استعمال کرے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو پابند کر دیا ہے کہ وہ انسان کے حکم کی تعمیل کرے، اس لئے کرۂ ارض مسلسل اور متواتر آتش فشاں بنتا جا رہا ہے۔ یقیناً انسان نے اگر اپنی حالت نہ بدلی تو عنقریب زمین اس کی نوع کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔

فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارُ

روزہ

روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ روزے کے عظیم فوائد اور بے پایاں اثرات کو بیان کیا جائے تو اس کے لئے ہزاروں ورق بھی ناکافی ہوں گے۔ مختصر یہ کہ روزہ امراض جسمانی کا مکمل علاج ہے۔ روحانی قدروں میں اضافہ کرنے کا ایک مؤثر عمل ہے۔ برائیوں سے بچنے کے لئے ایک ایسی ڈھال ہے جس کا توڑ کوئی نہیں۔ روزے دار ایک مخصوص دروازے سے جنت میں داخل ہوں گے۔ قیامت کے دن روزہ اس بندہ کی سفارش کرے گا جس نے پورے ادب و احترام کے ساتھ روزہ کو خوش آمدید کیا تھا۔ روزہ رکھنے سے جسمانی کثافتیں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کے اندر لطیف روشنیوں کا بہاؤ تیز تر ہو جاتا ہے۔ روشنیوں کے تیز بہاؤ سے آدمی کے ذہن کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے سامنے فرشتے آجاتے ہیں اور وہ غیب کی دنیا میں اپنی رُوح کو سیر کرتے دیکھتا ہے۔

شعبان کی آخری تاریخ کو حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

"لوگو! تم پر ایک بہت عظمت و برکت کا مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں ایک رات ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔"

خدا نے اس مہینہ میں اپنے بندوں پر روزے فرض کئے ہیں۔ قرآن پاک اس مہینہ میں نازل ہوا۔ دوسری آسمانی کتابیں بھی اسی مہینہ میں نازل ہوئیں۔ حضرت ابراہیمؑ کو

رمضان کی پہلی یا تیسری تاریخ کو صحیفے عطا کئے گئے۔ حضرت داؤدؑ کو رمضان المبارک میں ۱۲ یا ۱۸ کو زبور دی گئی۔ اسی مہینہ کی ۱۶ تاریخ کو حضرت موسیٰؑ کو توراۃ دی گئی اور حضرت عیسیٰؑ کو بھی اسی رمضان المبارک کے مہینے کی ۱۲ یا ۱۳ کو انجیل دی گئی۔ مختصر یہ کہ رمضان جس میں نازل ہوا قرآن، ایک پُر عظمت اور فضیلت و حکمت سے معمور مہینہ ہے جو انسانی شعور کو مصفّٰی اور مصیقل بنا دیتا ہے۔ محض اللہ کے لئے بھوکے پیاسے رہنے سے آدمی کی رُوح آسمانوں کی وسعتوں میں پرواز کر کے عرش کی رفعتوں کو چھو لیتی ہے۔

روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی امتوں پر فرض رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔"

یہی وہ باسعادت مہینہ ہے جس میں حضرت جبرئیلؑ نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سناتے تھے اور رسول اللہ سے قرآن سنتے تھے۔

آپ بھی قرآن ٹھہر ٹھہر کر اور سمجھ سمجھ کر پڑھیئے۔ اس عمل سے خدا کے ساتھ بندے کا تعلق مضبوط ہوتا ہے۔ دل کھول کر غریبوں، بیواؤں، یتیموں اور ناداروں کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کیجئے۔ فیاضی اور سخاوت کے پیکر، اللہ کے رسولؐ رمضان میں بہت زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔

آیئے! عہد کریں کہ ہم بھی رسول اللہ کی عادت مبارکہ پر عمل کر کے اپنے غریب بھائیوں کی ہر طرح مدد کریں گے۔

●●●

غارِ حرا میں مراقبہ

انسانی شعور اور اس کے ارتقا کا تذکرہ، ہمیں لازماً اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ جس مقام یا جس حیثیت میں ہم آج موجود ہیں اس کا سہرا ہمارے اسلاف کے سر بندھا ہوا ہے۔ نوعِ انسانی کے جدِ امجد آدم کو جب اس دنیا میں پھینکا گیا تو وہ شعور کی اس منزل میں تھے جہاں آج کا ایک نوزائیدہ بچہ ہوتا ہے۔ اس بچے (آدم) کی زندگی کے لمحات آن بنے۔ آن سیکنڈوں میں تبدیل ہوئی۔ سیکنڈ منٹ بنے۔ منٹ نے خود کو گھنٹوں میں گم کر دیا۔ گھنٹوں نے رات دن کا لباس زیبِ تن کیا۔ رات اور دن نے سالوں کا روپ دھارا۔ سال کی گھڑیاں صدیوں کی آغوش میں دم توڑتی رہیں۔ اور یوں قرن وجود میں آتے رہے۔

آدم نے شعور کا سانس لیا تو زندگی قائم رکھنے کے لئے کچھ کرنے، کچھ کھانے، کچھ پہننے کے لئے تقاضا ابھرا۔ تقاضے میں شدت پیدا ہوئی تو گداز بنا۔ اور یہ گداز آنکھوں سے بہہ نکلا۔ اس سیلِ رواں پر بند باندھنے کے لئے جبریلِ امین عرش سے فرش پر اُترے اور آدم سے گویا ہوئے :

" اے بھولے بادشاہ ! رونے دھونے سے کام نہیں بنے گا۔ تم نے خود اپنے اُوپر ظلم کیا ہے۔ اس ظلم کی چکی پیسنے کے لئے کچھ دو، کچھ لو کے مصداق محنت کرو گے تو پاؤ گے۔ اٹھو اور نافرمانی کی پاداش میں زمین پر مشقت کرو اور پیٹ کا ایندھن جمع کرو۔"

قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں" میں نے یہ تمثالیں دیکھی ہیں کہ ـــــ حضرت جبرئیلؑ آگے آگے چل رہے تھے اور آدم اُن کے نقشِ پا پر آہستہ خرام پیچھے پیچھے۔ قطعۂ زمین کے ایک مربع پر حضرت جبرئیل کھڑے ہو گئے اور کہا۔" یہ کھیت ہے، یہاں بیج ڈالو اور اس کو سینچ سینچ کر پروان چڑھاؤ۔ کھاؤ اور پیو !"

آدم تیزی سے دو قدم آگے بڑھے اور کہا۔" یہاں تک حد مقرر کر دو۔"

حضرت جبرئیلؑ نے بہت ہی دُکھ کے ساتھ کہا۔ ہائے افسوس، صد افسوس ! تم نے اپنی اولاد میں حرص کا بیج بو دیا ہے۔ یہ بات تمہاری عقل میں کیوں نہ آئی کہ یہ ساری زمین اللہ نے تمہاری ملک قرار دے دی ہے۔"

نوعِ آدم کا پہلا ارتقا یہ ہوا کہ اس نے زمین میں بیج بونا سیکھا۔ زمین کی کوکھ سے کانٹوں نے جنم لیا تو آدم نے شعوری طور پر چبھن محسوس کی، پھول کھلے تو ذہن وارفتگی کے عالم میں آسمانوں کی رفعتوں کو چھونے لگا۔

شگوفے اور خار، پھول اور کانٹے اپنی ذات میں ایک محسوساتی ردِ عمل ہیں۔ ردِ عمل طرزِ فکر کی نشاندہی کرتا ہے۔ طرزِ فکر میں ایمان، یقین، مشاہدہ موجود ہے تو آدم کی اولاد سکون آشنا ہے۔ طرزِ فکر میں بے یقینی، شک اور کور چشمی ہے تو زندگی کانٹوں بھری ایک سیج ہے، ہر کروٹ لہو لہو اور ہر سانس فنا ہے۔

نوعِ انسانی اپنے باپ آدم کے اس ورثہ پر رواں دواں ہے۔ آدم نے نافرمانی کی، اولاد کو نافرمانی کا ورثہ منتقل ہوا۔ آدم نے عجز و انکسار کے ساتھ عفو و درگزر کی درخواست ربِ کائنات کے حضور پیش کی اور پکارا:" اے ہمارے رب! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ اگر آپ نے ہمیں معاف نہیں کیا اور ہمارے اوپر رحم نہیں کیا تو

ہم تیری نعمتوں سے محروم رہ جائیں گے۔ اور یہ نقصان ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

ایک طرزِ فکر بندے کو خالق سے قریب کرتی ہے۔ دوسری طرزِ فکر بندے کو خالق سے دُور کرتی ہے۔ ہم جس طرزِ فکر سے جس قدر قریب ہوجاتے ہیں اسی مناسبت سے ہمارے اوپر رحمتوں یا صعوبتوں کے دروازے کھلتے رہتے ہیں۔ انعام یافتہ شخص آلام و مصائب کی زندگی سے ناآشنا ہوجاتا ہے اور یہ دنیا اس کے لئے جنّت کا گہوارہ بن جاتی ہے۔

ہم اس رحمت و عنایت کو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پہلی سنت ادا کرکے نہایت آسانی کے ساتھ حاصل کرسکتے ہیں۔ محبُوبِ خدا کی اوّلین سنّت غارِ حرا میں مراقبہ ہے۔

●●●

نماز

درازریش، غزالی آنکھیں، کھلی پیشانی، کتابی چہرہ ــ ایک بڑے عالم فاضل تشریف لائے۔ دورانِ گفتگو حدیث کا تذکرہ نکل آیا۔ صاحب موصوف نے کہا:

"حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے قلم اس کو لکھ کر خشک ہوگیا۔ جب قلم لکھ کر خشک ہوگیا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روحانیت کیا ہے ؟"

روزانہ صبح ہوتی ہے۔ صبح کے تاثرات اور ماحول بھی موسم کے لحاظ سے یکساں ہوتا ہے۔ مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہر صبح نئی صبح ہے۔ رات آتی ہے۔ ایک بستر، ایک چارپائی، ایک کمرہ اور ایک ہی گھر میں ہم سوتے ہیں مگر سمجھتے یہ ہیں کہ ہر رات نئی رات ہے۔ بھوک لگتی ہے تو ہم کھانا کھا لیتے ہیں۔ روٹی ہماری خوراک ہے لیکن ہر مرتبہ ہم اسے نئی روٹی سمجھ کر کھاتے ہیں۔ کیا ہم فریب کی زندگی نہیں گزار رہے ہیں؟ اور جب ساری زندگی ہی فریب ہے تو روحانیت کے بلند بانگ دعووں کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟ قوم پہلے ہی کون سی باعمل ہے کہ آپ مزید بےعملی کا درس دے رہے ہیں۔"

اس حدیث کی تشریح بیان کرتے ہوئے ابدالِ حق قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا تھا:

"ایک کتاب ہے جو لکھی جاچکی ہے۔ یعنی یہ کتاب ماضی (RECORD) ہے۔ اب اس کتاب کو پڑھنے کی طرزیں مختلف ہیں۔ اگر کتاب شروع سے ترتیب و تسلسل

سے پڑھی جائے یعنی ایک لفظ، پھر دوسرا لفظ، ایک سطر، پھر دوسری سطر، ایک صفحہ، پھر دوسرا صفحہ، پھر تیسرا صفحہ۔ علیٰ ہٰذالقیاس اسی طرح پوری کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو مطالعہ کی یہ طرز وہ طرز ہے جو بیداری (شعور) میں کام کرتی ہے۔

انسان کا شعوری تجربہ یہ ہے کہ ایک دن گزرتا ہے، پھر دوسرا دن گزرتا ہے، ایک ہفتہ گزرتا ہے، پھر دوسرا ہفتہ گزرتا ہے۔ اسی طرح ماہ و سال اور صدیاں اسی ترتیب اور اسی طرز سے یعنی ایک کے بعد ایک کرکے گزرتی رہتی ہیں۔ منگل کے بعد جمعرات کا دن اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک کہ بدھ کا دن نہیں گزر جاتا۔ شوال کا مہینہ اُس وقت تک نہیں آتا جب تک کہ رمضان اور اس کے پہلے کے مہینے نہیں گزر جاتے۔ یہ طرز انسان کے اندر شعوری طرز (زمان و مکان کی قید و بند) ہے۔ اس طرز کو بیداری کہا جاتا ہے۔ اور جب یہ شعوری طرز کتاب کے ورق کے دوسرے صفحے پر منتقل ہوجاتی ہے تو ٹائم اسپیس سے آزاد لاشعوری طرز بن جاتی ہے۔ آسان الفاظ میں اس بات کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ایک ہی طرز دو خانوں میں رد و بدل ہو رہی ہے اور اس رد و بدل یا خیال کا الٹ پلٹ ہونا ہی ہماری زندگی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہاں جو کچھ ہے وہ کتاب میں لکھا جاچکا ہے۔ کتاب ازل ہے اور ازل ماضی ہے۔ رہا گناہ ثواب، اچھائی برائی کا تصور۔ یہ اطلاع میں معنی پہنانے کا ایک عمل ہے۔ وہی چیز جو اچھی ہے بُری بھی ہے۔ ایک آدمی نماز قائم کرتا ہے لیکن قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق اگر وہ اپنی نماز کی حقیقت (نماز میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور ربط قائم ہونا) سے بے خبر ہے تو نماز اس کے لئے ہلاکت اور بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

صلوٰۃ (نماز) کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مومن کو غیب کی دنیا میں داخل کردیتی ہے۔

جب کہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ غیب کی دنیا سے باخبری تو کجا نماز میں حضورِ قلب بھی نصیب نہیں ہوتا۔ نمازی جیسے ہی نیت باندھتا ہے خیالات کی یلغار اس کے اوپر مسلط ہوجاتی ہے۔

ابدالِ حق، قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں قلم لکھ کر خشک ہوگیا کا روحانی مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں ماضی کی حکمرانی ہے اور بندے نے امانت قبول کرکے اپنے اوپر یہ ذمہ داری عائد کرلی ہے کہ وہ ماضی کی حکمرانی کو قبول کرے۔ ماضی زمانہ ہے، زمانہ اللہ ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی مقام ہے: "زمانے کو بُرا نہ کہو، زمانہ اللہ ہے۔"

لَاتَسُبُّوا الدَّهْرَ اِنَّ الدَّهْرَ هُوَ اللہ۔

"ازل میں سب کچھ ہوچکا ہے" سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبورِ محض بنادیا ہے بلکہ ازل میں جو کتاب لکھی گئی ہے اس میں جہاں زحمت اور رحمت کی دو طرزیں متعین ہیں وہاں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ بندہ اپنا اختیار استعمال کرکے اپنے لئے کسی ایک طرز کا انتخاب کرسکتا ہے۔ کتاب کی تحریر یہ ہے کہ زید کے لئے دو راستے ہیں — ایک کا انجام زحمت ہے، دوسرے کا نتیجہ رحمت ہے۔

روحانیت کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ روحانیت کے علاوہ کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جو انسان کو ماضی (ازل میں لکھی ہوئی کتاب) سے متعارف کراسکے۔

●●●

وراثت

قانونِ قدرت کی رُو سے ہر شے کا ایک تشخص ہے، خواہ ہم اُسے غیر مرئی سمجھیں اور کوئی اہمیت نہ دیں۔

اس دنیا میں انسان کی خواہشات اور تمنائیں اس کے اعمال و افعال کا محور بنتی ہیں اور عموماً یہ اس کے گوشت پوست کے جسم تک محدود رہتی ہیں۔ قانون کے تحت یہ خواہشات اور تمنائیں بھی تشخص کی حامل ہیں۔ دولت، عزت اور وقار کی خواہش بھی ایک تشخص ہے۔ شہرت، ناموری اور بالادستی کی آرزو بھی تشخص رکھتی ہے۔ صلہ اور معاوضہ کی تمنا بھی بے تشخص نہیں۔ واضح رہے کہ تقاضوں کی تکمیل اور خواہش اور تمنا کے حصول میں بڑا فرق ہے۔

جب انسان کسی خواہش کی تکمیل کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے تو درحقیقت وہ اس کے تشخص کو اپنے اوپر مسلط کر لیتا ہے۔ اگر انسان کا مطمحِ نظر ذاتی مفاد ہے تو وہ جسمِ خاکی میں مقید ہو جاتا ہے جہاں تنگی ہے، گھٹن ہے، اندھیرا ہے۔ وہ اس تشخص کے طول و عرض میں بند رہتا ہے، باہر نہیں نکل سکتا۔ تیرہ و تاریک قید خانہ میں بند قیدی کی طرح اس کا رابطہ وسیع و عریض رنگین دنیا سے باقی نہیں رہتا۔

فعل و عمل میں اپنی ذات کو اوّلیت دینے سے جو خول وجود میں آتا ہے وہ انسان کا رشتہ لازمانیت اور لامکانیت سے منقطع کر دیتا ہے۔ وہ ایک محدود دائرے کے اندر سوچتا، سمجھتا اور محسوس کرتا ہے۔ اس کی مثال ریشم کے کیڑے سے دی جا سکتی ہے

جس کا دائرہ کار ریشم کے خول تک محدود رہتا ہے اور وہ بیرونی دنیا سے لاتعلق ریشم کے تار و پود کو مستحکم کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا نحیف و ناتواں جسم ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔

انبیائے کرامؑ نے اس بات کو سمجھا کہ یہ کائنات ایک ماورار الماورا اور لامحدود تشخص کی بنا پر قائم ہے۔ انہوں نے اپنے اعمال و افعال کا مرکز و منتہا اس ذات کو بنا لیا اور اپنی ذات سے دست بردار ہو کر خود کو اس لامحدود ہستی کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے ہر چیز کو اس ذاتِ عظیم کے واسطے (REFERENCE) سے پہچانا، خود کو درمیان سے ہٹا دیا۔

نتیجہ میں اُن کی ہستی اور اُن کے ارادے کی نفی ہو گئی۔ اور وہ خالقِ اکبر کے ارادے کے مظہر بن گئے۔ جب مٹی کا پتلا اور خواہشات کا خول محلِ توجہ نہیں رہا تو پتلے کے اندر موجود رُوحِ الٰہی آشکار ہوئی اور نظر اس کے جلال و جمال سے خیرہ ہو گئی۔ خفی جلی ہو گیا اور غیب شہود بن گیا۔ محدودیت لامحدودیت سے مغلوب ہو گئی اور خوف و حُزن کی جگہ خوشی، سرشاری اور اطمینانِ قلب نے لے لی۔

صاحبِ مقامِ محمودی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد بھی ایسے قدسی نفس حضرات ہر زمانے میں موجود رہے جنہوں نے عشقِ نبیؐ میں اپنی ہستیوں کی نفی کی اور اطاعتِ رسولؐ میں خودی کو مٹا دیا۔ ان حضرات پر مقامِ نبیؐ منکشف ہوا اور پھر ذاتِ اکبر سے تعارف حاصل ہوا۔

جب یہ حضرات مخلوقِ خدا میں ظاہر ہوئے تو لوگ ان کی جانب پروانہ وار کھنچے حالانکہ ان کے پاس نہ مال و زر تھا اور نہ کوئی اور ترغیب کا ذریعہ۔ ان حضرات نے طبیعتِ

اور بے غرض جس طرح مناسب سمجھا خلقِ خدا کی خدمت کی اور ان کے سامنے حق کی شمع بن کر فروزاں رہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے ساری زندگی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے سامانِ دنیا اپنے گرد اکٹھا کیا، چند روز اُسے سینے سے لگانے کے بعد دوسرے لوگوں کے لئے وراثت میں چھوڑ گئے۔ ان کے مرنے کے بعد لوگوں نے ان کے نام بھی فراموش کر دیئے۔

دوسری طرف وہ پاکیزہ نفس لوگ ہیں جن کے ذکر پر آج بھی پیشانیاں عقیدت و محبت کے جذبات سے جھک جاتی ہیں۔ جب تک یہ لوگ عوام میں موجود تھے، پریشان قلوب اور سکون کے طلب گار اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جب پسِ پردہ چلے گئے تب بھی اُن کا تشخص لوگوں کے سامنے موجود رہا۔ اس لئے کہ انہوں نے ذاتی اغراض و مقاصد اور خود پسندی کو بالائے طاق رکھ دیا، مایا جال ان کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکا۔ ان سعید روحوں نے یہ راز جان لیا تھا کہ خود سے گزرے بغیر خدا نہیں مل سکتا۔

●●●

خلائی تسخیر

اس مادی ترقی یافتہ، پُرآشوب، احساسِ عدم تحفظ کے عفریت، بے اطمینانی، ڈر اور خوف کے شجر اور رُوحانی اقدار سے دُور زمانہ میں بھی ایسے پاکیزہ نفس حضرات موجود ہیں جن کے قلوب میں اللہ اور اس کے رسُولؐ کے مشن کی شمع روشن ہے۔ رحمتیں ہوں ان پروانوں پر جنہوں نے رحمت للعالمینؐ کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے روحانی ڈائجسٹ کو ایک گھر سے دوسرے گھر تک پہنچایا۔ مساجد میں، خانقاہوں میں، مجلسوں اور لائبریریوں میں، اپنے اور اپنے احباب کے ڈرائنگ رُومز میں اس رسالہ کی نورانی اور روحانی تحریروں کی ضوافشانی سے لوگوں کے دل منور کئے۔ یہ آپ کی پُرخلوص کوششوں، ایثار اور دل میں اُللہ کے دین کی تڑپ کا نتیجہ ہے کہ چند سال کی مختصر مدت میں آپ کا روحانی ڈائجسٹ دنیا کے ہر خطے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جانشیں اہل اللہ کے "پیغام سعید" کو عام کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔ مشائخ اور اُن علما حضرات کے ہم سب اراکینِ ادارہ اور قارئین شکر گزار ہیں جو اس کی اشاعت میں کمر بستہ ہیں، جو منبرِ رسولؐ پر اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور مجالسِ حسنہ میں اس کی تحریریں پڑھ کر یہ بتاتے ہیں کہ انسان کا مقصدِ حیات اپنی رُوح سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔

ہم اپنے قارئین کے گراں قدر مشوروں سے ایسے دل چسپ اور فکر انگیز اضافے کرنا چاہتے ہیں جن سے سسکتی ہوئی انسانیت پر یہ بات منکشف ہو جائے کہ قرآن

سائنسی فارمولوں کی ایک دستاویز ہے۔ اس کی مقدس آیات میں تفکر کیا جائے تو ہم خلائی تسخیر میں ایک ایسا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جہاں سائنس داں کھربوں ڈالر خرچ کر کے بھی نہیں پہنچ سکے ہیں۔

قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق تسخیر کائنات ہمارا ورثہ ہے جس پرت دغن لگا کر دبیز پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔ ہماری برابر کوشش ہے کہ ہم اذہان تیار کر کے بتدریج وہ بات منظر عام پر لے آئیں جو "فی الارض خلیفہ" کی حیثیت سے ہمیں چار دانگ عالم میں نمایاں اور ممتاز کر دے اور اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق زمین و آسمان پر ہماری حکمرانی قائم ہو جائے۔

آپ سے درخواست ہے کہ بدستور سابق نور سے مرکب ان تحریروں کو زیادہ سے زیادہ متعارف کراتے رہیں۔ رسالے پڑھے لکھے لوگوں کی خدمت میں پیش کریں۔ کم تعلیم یافتہ بہنوں، بھائیوں اور بزرگوں کو خود پڑھ کر سنائیں۔ مسائل و مشکلات میں اللہ کی مخلوق کی خدمت کریں۔ پریشانیوں، مصیبتوں، الجھنوں اور لاعلاج بیماریوں کے سدباب کے لئے جہاں میری ضرورت ہو مجھے مطلع کریں۔ انشاء اللہ ہم سب سرخرو ہوں گے کہ ہمارے اوپر اللہ کے کریم اور رحیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ ہے۔

●●●

غلام قومیں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو قومیں اپنی حالت نہیں بدلنا چاہتیں، اللہ تعالیٰ ان کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ ہم نے من حیث القوم اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین سے تنفر برتا ہے اور اپنے آپ کو عذاب و ثواب کے چکر میں محدود کر لیا ہے۔ اسی قدر محدود کر لیا ہے کہ تخلیقی فارمولوں سے ہم بالکل بے بہرہ ہو گئے ہیں۔ قرآن ہدایت، استرجاع ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے زمین، آسمان اور ان کے اندر جو کچھ ہے سب کا سب تمہارے تابع فرمان کر دیا ہے۔ تمہارے لئے سورج کو مسخر کر دیا ہے، تمہارے لئے چاند کو مسخر کر دیا ہے، تمہارے لئے ستاروں کو مسخر کر دیا ہے اور ہم ہیں کہ ہم نے اس تسخیری عمل کو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ قرآن ہمارا ہے اور قرآن واشگاف الفاظ میں کہتا ہے کہ لوہے میں انسانوں کے لئے بے شمار فائدے محفوظ ہیں۔ ظاہر ہے قرآن پاک یہ کہہ رہا ہے کہ یہ فائدے جو اللہ تعالیٰ نے لوہے کے اندر محفوظ کر دیئے ہیں انہیں تلاش کرو اور جب تم ان فائدوں کو تلاش کرو گے تو ان سے اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچے گا اور اللہ کی مخلوق میں تمہاری عزت و توقیر ہوگی۔ اللہ کا قانون اپنی جگہ برحق ہے۔ جن لوگوں نے لوہے کی صلاحیتوں کو تلاش کیا وہ لوگ قومی اعتبار سے عزت دار ہو گئے اور ہم نے قرآن پاک کی تعلیمات کو نظر انداز کیا، ہم ذلیل و خوار ہو گئے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ

اپنی جگہ اہم ہیں، فرض ہیں، ضروری ہیں۔ اس لئے کہ ان ارکان کی ادائیگی سے رُوح کو تقویت ملتی ہے، رُوحانی صلاحیتیں متحرک اور بیدار ہوتی ہیں لیکن یہاں معاملہ بالکل اُلٹا اور برعکس ہے کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ رُوح کی صلاحیتیں ہمارے اندر موجود بھی ہیں یا نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے اندر تفکر موجود نہیں ہے ہم عمل تو کرتے ہیں، عمل کی حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ جب کوئی بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم الیقین کی دولت سے نوازا ہے، قرآن پاک میں تفکر کرتا ہے تو اس کے سامنے قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ آجاتی ہے اور وہ اس بات کا مشاہدہ کرلیتا ہے کہ قوموں کا عروج وزوال اس بات پر منحصر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمائی ہوئی باتوں پر جن قوموں نے تفکر کیا وہ سرفراز ہوئیں اور جن قوموں نے تفکر کو رد کیا، وہ قومیں غلام بن گئیں۔ بڑی ستم ظریفی ہے کہ ہم جب یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ سائنس کی ترقی میں وہ تمام فارمولے کام کر رہے ہیں جو ہمارے اسلاف نے چھوڑے ہیں اور جو فی الواقع ہمارا ورثہ تھے لیکن چونکہ ہم نے اس ورثے کو کوئی اہمیت نہیں دی، اس لئے دوسرے لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور ہم ایک پس ماندہ اور بھکاری قوم بن گئے۔

●●●

عَدم تحفظ کا احسَاس

آیئے اس نشست میں ہم زندگی اور اس کے تقاضوں کی ماہیت پر غور و فکر کرتے ہیں۔ یہ بات ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ زندگی تقاضوں کے دوش پر سفر کررہی ہے ہمارے اندر تقاضے پیدا ہوتے ہیں اور ہم ان کی تکمیل کرتے ہیں۔ ہمیں بھوک لگتی ہے تو ہم بھوک رفع کرنے کے لئے غذا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پیاس لگتی ہے تو فوراً ہمارا رجحان پانی کی طرف ہوجاتا ہے۔ ہم کھانا کھالیتے ہیں، پانی پی لیتے ہیں۔ یعنی تقاضوں کی تکمیل کرلیتے ہیں۔ اس طرح ہمیں تسکین مل جاتی ہے اور ہم مطمئن ہوجاتے ہیں۔

اگر ہم کسی تقاضہ کو نظر انداز کرتے ہیں تو ہمارا ذہن اس میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور ہمیں بار بار اس کی عدم تکمیل کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم بے چینی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اضطراب و پریشانی ہمارے اندر دَور کرنے لگتی ہے۔ ہم کوئی بھی کام ارتکاز توجہ سے نہیں کرسکتے۔ بار بار ہماری توجہ بھٹک جاتی ہے۔

تمام تقاضوں کا یہی حال ہے۔ اور کھانا پینا، خوش ہونا، محبت کرنا، معاش کا کام کرنا، اولاد کی تعلیم وتربیت کرنا، ایثار و محبت، دوسروں کے کام آنا الغرض زندگی کا ہر عمل کسی نہ کسی تقاضہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ تقاضے دنیا کے ہر آدمی میں پیدا ہوتے ہیں اور دنیا کا ہر آدمی کسی نہ کسی طرح کبھی نہ کبھی، جلد یا بہ دیر ان تقاضوں کی تکمیل کرکے اطمینان حاصل کرتا ہے۔

جسم کے تقاضوں کی طرح انسان کی رُوح میں بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ رُوح کے تقاضے بھی انسانی شعور کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ ان تقاضوں کی تکمیل ہونی چاہیئے۔ روحانی تقاضے اور ان کی تکمیل جسمانی تقاضوں سے زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ان کے نتائج جسمانی تقاضوں کے مقابلے میں زیادہ مسلسل اور عظیم الشان ہوتے ہیں اور ان کی تکمیل کے نتیجے میں انسان کو بہت زیادہ سکون، بہت زیادہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ ہر فکر کو بھول جاتا ہے۔ ایک سرشاری اور ایک کیف اس کے ذہن کا احاطہ کر لیتا ہے۔ چاروں طرف سے خوشی اور خوشی کے لوازمات اُسے حصار میں لے لیتے ہیں۔ اور کسی غم یا کسی پریشانی کو اس کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتے۔

ان رُوحانی تقاضوں میں سب سے اہم اور سب سے زیادہ بنیادی تقاضہ جو ہر انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے وہ انسان کو احساس دلاتا ہے کہ اسے اپنے اللہ سے رابطہ پیدا کرنا چاہیئے اور اسے ان خوشیوں اور مسرتوں سے بہرہ مند ہونا چاہیئے جو کہ اس رابطہ، اس قربت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ انسان کی رُوح اس خوشی اور اس مسرت کے حصول کے لئے بے قرار ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ انسان اس ذہن کو پس پشت ڈال چکا ہے جو اُسے ایسے تقاضوں اور ان کی تکمیل کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے۔ انسان نے چند روزہ مادی زندگی کے عارضی تقاضوں کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ جسم فانی ہے اور جسمانی خوشیاں اور غم بھی عارضی ہیں۔ یہ سب جسم کی موت کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں گے۔ رُوح لافانی ہے۔ اس لئے ہر وہ چیز جو رُوح سے متعلق ہے اپنے اندر لافانیت کا پہلو رکھتی ہے۔ رُوحانی تقاضوں کی تکمیل کے نتیجے میں جو روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے وہ ہمیشہ کی مسرت و آرام کی ضامن ہوتی ہے۔

لیکن المیہ یہ ہے، جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں انسان ان سب باتوں کی اہمیت کو فراموش کر چکا ہے، وہ اپنی رُوح سے دور ہو چکا ہے اور رُوحانی تقاضوں کی تکمیل کی طرف سے لاپروا ہو گیا ہے لیکن اس کی رُوح اُسے اب بھی ان تقاضوں کی تکمیل کی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے۔ انسان اسے خواہ کچھ بھی معنی پہنائے، اُسے کسی بھی مفہوم میں قبول کرے اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رُوح کے بار بار خبردار کرنے پر بھی جب ہم اس کی تکمیل نہیں کرتے تو تقاضے کا ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ یہ وہی ردِ عمل ہے جو جسمانی تقاضوں کی عدم تکمیل سے بھی پیدا ہوتا ہے۔

اس ردِ عمل کی کیفیت مذکورۂ اولی کیفیت سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ کبھی اس کیفیت کو انسان ذہنی انتشار کی صورت میں محسوس کرتا ہے، کبھی بے اطمینانی اور عدم سکون سے تعبیر کرتا ہے، کبھی عدم تحفظ کے احساس کی حیثیت دے دیتا ہے۔ لیکن یہ سب ایک روحانی تقاضے کی عدم تکمیل کے SIDE EFF-ECTS ہیں۔ اور وہ تقاضہ یہ ہے کہ انسان کی رُوح چاہتی ہے کہ انسان اللہ تعالےٰ سے قربت حاصل کرے اور اس طرح اپنے اصل مقام پر جسے وہ ماضی میں رد کر چکا ہے فائز ہو جائے اور اس طرح ہر پریشانی اور غم سے محفوظ و مامون ہو جائے۔

لہٰذا!

ہم سب کے لئے لازم ہے کہ ہم رُوح کے اس تقاضے کی تکمیل کے لئے عملی اقدام مراقبہ کریں۔ اللہ تعالےٰ ہماری رہنمائی فرمائے

آمین!

●●●

روشنی

دوستو، غیب و شہود کے مسافرو، روحانیت کے پرستارو!

جب پستی اور بلندی کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو یہ بات زیرِ غور آتی ہے کہ پستی کیا ہے اور بلندی کیا ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں یہ بتاتی ہیں کہ جن قوموں میں تفکر اور ذہنی کاوشیں بروئے کار آتی رہیں وہ قومیں بلند ہیں۔ اور جن اقوام کے شعور میں سے تفکر نکل گیا وہ پست اور خوار ہیں۔ پستی اور بلندی کے یہی مناظر دیکھنے کے لئے قدرت نے کچھ ایسے وسائل پیدا کئے کہ میں اپنے پس ماندہ اور ترقی پذیر ملک سے خلائی وسعتوں میں سے گزر کر لندن پہنچا۔ مجھے یقین ہے کہ قدرت یہ چاہتی ہے کہ پستی اور بلندی کی راہوں میں میرا تجربہ بلند ہو۔

میں بنیادی طور پر ایک ایسے عالم و فاضل گھرانے میں پیدا ہوا ہوں جہاں پستی سے مراد صرف یہ ہے کہ آدمی نماز روزے سے غافل ہے اور عروج یہ ہے کہ آدم زاد ثواب کی گٹھریاں باندھ رہا ہے۔ جس دنیا کا اب میں تذکرہ کر رہا ہوں وہاں میں نے عذاب و ثواب نام کی کوئی چیز نہیں دیکھی۔ لیکن انہیں اپنی قوم سے زیادہ خوش حال، زیادہ منظم، زیادہ انسان دوست دیکھا۔ عالم یہ ہے کہ وہاں اگر کوئی آدمی بے کار ہے تو اسے اتنا گزارہ الاؤنس ملتا ہے کہ وہ بہ آسانی دنیا کی تمام آسائشوں کے ساتھ اپنی زندگی گزارتا ہے۔ وہاں کے رہنے والے لوگوں کی ذہنی

زندگی کا عالم یہ ہے کہ ترقی پذیر ملک کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ انہیں دنیا کی ہر وہ چیز دستیاب ہے جو انسانی زندگی میں کسی بھی طرح کام آ سکتی ہے۔ علمی ترقی کا حال یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نئی نئی ایجادات سامنے آتی رہتی ہیں۔ لیکن وہاں جس چیز کی کمی ہے وہ سکونِ قلب ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو بغیر دواؤں کے سوتے ہیں۔

نقطۂ فکر یہ ہے کہ ترقی پذیر اور پس ماندہ قوم بھی سکونِ قلب سے ناآشنا ہے باوجودیکہ اربوں، کھربوں، سنکھوں نیکیوں کے انبار اُن کے پاس موجود ہیں۔ لیکن روشنی میسر نہیں ہے جو روشنی مسرت و شادمانی بن کر لہر کی طرح خون میں دوڑتی ہے۔ جس بندہ کے پاس نیکیوں کا جتنا بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے، دیکھا یہ گیا ہے کہ وہ سکون سے اتنا ہی دُور ہے۔ ایک خشکی ہے جو آکاس بیل کی طرح وجود کو چمٹ گئی ہے۔ قنوطیت ہے کہ جس نے ہشت پا کی طرح ہمیں دبوچ رکھا ہے۔ نیکی کے متوالوں کو یہاں بھی دیکھا اور وہاں بھی دیکھا۔ وہاں کی حالت یہاں سے زیادہ دگرگوں ہے۔ فرقہ پرستی کی لعنت اتنی زیادہ ہے کہ شراب میں مدہوش پولیس جوتوں سمیت کتوں کو ساتھ لے کر مسجد میں داخل ہوتی ہے اور مسجد کو سیل بند کر دیتی ہے۔ ہر شخص کا اصرار یہ ہے کہ میں نیک ہوں، دوسرے فرقے کے لوگ قابلِ گردن زدنی ہیں۔ یہ حال پس ماندہ قوم کا ہے۔

ان قوموں کا حال جو ترقی کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ خود کو پیش کر رہی ہیں اس سے کچھ مختلف نہیں۔ یہ وہ قوم ہے جس نے تجارتی اور مالی منفعت کے لئے خوبصورت دنیا کو جہنم بنا دیا ہے۔ جنگ کرنے شاعروں کی سہانی راتوں کو دھندلا دیا ہے پرشکار اور سحر انگیز نسیم صبح میں ایٹمی ایندھن کا زہر گھول دیا ہے۔ یہ وہ عروج یافتہ قوم

ہے جس نے پھولوں کی مسکراہٹ چھین لی۔ اب پرندوں کی زمزمہ پرور چہچہاہٹ ایک نغمۂ دل سوز بن کر رہ گئی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کو عدم تحفظ کے عمیق غار میں دھکیل دیا ہے۔ عدم تحفظ کی حالت میں سسکتی ہوئی انسانیت کے لئے چاندنی کا حسن اور دھوپ کی خوبصورتی ماند پڑ گئی ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ ایٹمی تجربات، ڈیزل اور پٹرول کے بخارات، جیٹ طیاروں کے آتشی فضلات نے فضا کو کچھ اس طرح زہر آلود کر دیا ہے کہ انسان کے اندر جانے والا ہر سانس زہرناک بن گیا ہے اور اس زہرناکی نے انسان کو زیروزبر کر دیا ہے۔ اعصاب ٹوٹ گئے ہیں، ذہن بکھر گیا ہے۔ دل ہے کہ ہر لمحہ ڈوب جانے کو بضد ہے۔ ترقی کے پُرفریب پردوں میں سسکتی، تڑپتی اور روتی ہوئی قوم نے عافیت اسی میں سمجھی کہ عدم تحفظ کے خوفناک عفریت سے فرار اختیار کیا جائے لیکن اس فرار میں بھی انہیں لالچی اور خودغرض جنسی ذہن نے شکار کی طرح دبوچ لیا۔ اور اس عہد کے ترقی یافتہ انسان نے عدم تحفظ کے احساس سے فرار حاصل کرنے کے لئے ہیروئن، ایل ایس ڈی، راکٹ، چرس، مینڈرکس جیسی چیزیں ایجاد کرلیں اور عام آدمی ایک الجھن سے نکلنے کے لئے دوسری ہزاروں الجھنوں میں مبتلا ہو گیا۔

اس ساری گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ جب تک نوعِ انسانی کے افراد میں کاروباری ذہن کام کرتا رہے گا اُسے کبھی سکون میسر نہیں آئے گا۔ ترقی یافتہ قوم اس لئے عذاب میں مبتلا ہے کہ ترقی کے پیچھے اس کا اپنا ذاتی فائدہ ہے۔ ہر ترقی سونے کا ڈھیر جمع کرنے کا ذریعہ ہے۔ غیر ترقی یافتہ قومیں اس لئے پریشان ہیں کہ ان کا کوئی بھی عمل کاروباری تقاضوں سے باہر نہیں ہے۔ وہ اللہ کو بھی اس لئے یاد

کرتے ہیں کہ ان کے پیشِ نظر اپنی ذات کے لئے منفعت ہے جب کہ اللہ کے لئے یہ طرزِ فکر ناپسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"جو لوگ میری آیتوں کا کاروبار کرتے ہیں اُن کے پیٹ دوزخ کے انگاروں سے بھر دوں گا۔"

ظاہر ہے پیٹ کے اندر دہکتے ہوئے انگارے ایک کھلا عذاب ہیں اور یہی عذاب روپ دھار کر کبھی اضطراب بن جاتا ہے۔ کبھی بے چینی کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کبھی عدم تحفظ کا احساس بن کر لمحہ بہ لمحہ ہمیں خوف کی دنیا میں لے جاتا ہے اور ہمارے اوپر موت کی میٹھی نیند طاری کر دیتا ہے۔

محبت کے گیت

کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا بار بار یا زیادہ صحیح اندازوں کے مطابق سولہ مرتبہ تباہ ہو کر دوبارہ آباد ہوئی ہے ـــ خوبصورت، رنگین، باغ و بہار سے مزین، پُرکشش برفانی کہساروں، موتی کی طرح چمکتے دمکتے آبشاروں، آفتاب کی شعاعوں اور چاند کی کرنوں کا مسکن یہ دنیا ـــ اب پھر چالیس ہزار ایٹم بموں کی زد میں موت کے دہانے پر کھڑی ہانپ رہی ہے۔ زمین کے اندر بہنے والے چشمے، انسان کو ترقی کا راستہ بتانے والی معدنیات، نظامِ کشش ثقل با حسرت و یاس اپنے بیٹوں کے ہاتھوں اپنی ہلاکت کی منتظر ہے۔ جس زمین نے ہمیں پروان چڑھایا ہے آج وہ زمین، وہ دنیا ایک مجسم سوال بن گئی ہے کہ آدم زاد کس قصور، کس جرم اور کس پاداش میں زمین کی تباہی کے درپے ہے۔ آدم زاد کو اس کی جنم بھومی نے کیا کچھ نہیں دیا ہے۔ انگوٹھا چوستے بچے کی جوانی اور جوانی کی لذت اندوز کیفیات اور ان سرور کن کیفیات کے نتیجے میں دنیا کی رونق کیا زمین کا احسان نہیں ہے؟ یہ کیسی احسان فراموشی ہے کہ بچے اپنی ماں کی گود اجاڑ کرنے اور برباد کرنے پر مُصر ہیں!

خالقِ کائنات نے اس دنیا کو محبت، خوشی، مسرت و شادمانی اور ایثار کا گہوارہ بنایا تھا ـــ اور آج بھی دنیا کی ہر شے دیدۂ بینا کو مسرت اور خوشی مہیا کرتی ہے۔ خوبصورت خوبصورت رنگ برنگ چڑیاں، فطرت کے شاہد مناظر، پانی کا

اتار چڑھاؤ، پہاڑوں کی بلندی، آسمان کی رفعت، پھولوں کا حُسن، درختوں کی [illegible]، تاروں بھری رات، روشن روشن دن، ماں کی آنکھوں میں محبت کی چمک، بچے کا مچلنا اور کلکاری بھرنا، بہن کی پاکیزگی، بھائی کا خلوص، بیٹی کا تقدس، باپ کی شفقت یہ سب بلاشبہ نوعِ انسان کے لئے خوشی اور شادمانی کا سامان ہیں۔ ایک ماں کی طرح زمین بھی یہی چاہتی ہے کہ اس کی اولاد پُرمسرت زندگی گزارے، زمین کو دوزخ نہ بنا ڈالے۔ اس کے اوپر پھولوں کی بجائے انگاروں کی کاشت نہ کی جائے۔

ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والی ذات، اللہ کیا ہے؟ ـــ اللہ محبت ہے، اللہ خوشی ہے۔ اللہ نے کائنات کو صرف تخلیق ہی نہیں کیا۔ کائنات کو قائم رکھنے اور مسرت و شادمانی کو دوام بخشنے کے لئے آدم کو تخلیق کیا اور ذیلی تخلیق کی ذمہ داری عورت کے نازک کندھوں پر رکھی۔ عورت کے دل میں، اس کے ہر ہر رُوئیں میں اپنی وہ محبت انڈیل دی جو اللہ کی اپنی صفت ہے۔ خالقِ کائنات اللہ نے عورت کو تخلیق کا میڈیم بنا کر اس کے اندر تخلیقی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ستر میں سے ایک حصہ اپنی محبت منتقل کر دی تاکہ عورت ماں بن کر اللہ کی تخلیق کو قائم رکھے اور اس باغ کی آبیاری کرتی رہے جس کو پُربہار دیکھنا اللہ کے لئے سب سے بڑی خوشی ہے۔

میری بہنو، میری ماؤں، میری بیٹیو!

یہ دنیا آپ کے دَم سے پُررونق اور آباد ہے۔ آپ کی عظمت اس سے ظاہر ہے کہ نظامِ تخلیق آپ کے وجود سے قائم ہے۔ آپ ہر اس ہستی کی تخلیق کا باعث ہیں جس جس نے اللہ کے قانون کو سامنے رکھ کر اس زمین کو غم و آلام سے نجات دلانے کی کوشش کی ہے۔ ان میں عظیم مفکر بھی ہیں، انبیائے کرام اور ان کے دوست اولیاء اللہ بھی ہیں۔

عورت کی فضیلت و عظمت کا عالم یہ ہے کہ ماں کی آغوشِ راحت میں اللہ کے محبوب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت پائی اور وہ ماں ہی ہے جس کے دودھ سے آپؐ کا شعور پروان چڑھا اور اس شعور سے اللہ کے احکامات کو نوعِ انسانی تک پہنچایا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ ہر مصلح قوم کی وریدوں میں ماں کا خون دوڑ رہا ہے۔

یہ کیسی المناکی ہے کہ ــــ

سائنس کی پُرفریب ترقی کے پردے میں آپ کے نونہالوں کو چھیننے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ سائنس دانوں کا ایک کرتا دھرتا طبقہ چاہتا ہے کہ مسرّت کا قلعہ کھنڈر بن جائے۔ محبّت کے سوتے خشک ہو جائیں۔ اخلاقی، معاشرتی پابندیاں جو انسان کی بلندی کا باعث ہیں، ان کی تمام دیواریں منہدم ہو جائیں۔

چند مفاد پرست سرمایہ داروں نے انسانی عروج اور فہم و فراست کی تابانیوں کو اپنی تجوریاں بھرنے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ بلاشبہ دل کی پیوندکاری میڈیکل سائنس کا ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن دل کے ایک آپریشن پر تقریباً دو لاکھ روپیہ خرچ آتا ہے۔ عوام کا وہ کون سا طبقہ ہے جو اتنا زرِ کثیر خرچ کر کے ایک بیمار دل کے لئے زندگی طلب کر سکتا ہے۔ آپ نے دودھ پلا کر اپنے جگر گوشوں میں جو صلاحیت پیدا کی تھی وہ اب کاروبار بن گئی ہے۔ سونے چاندی کے سکّوں کی قیمت بڑھ گئی ہے اور انسان کی قیمت گھٹ گئی ہے۔

اے میری ماؤں، میری بیٹیو، اللہ کی تخلیق میں رنگ بھرنے والی عورتو!

اب آپ کے اوپر دوہری ذمہ داری آ گئی ہے۔ قانونِ قدرت آپ کو اپنی بادشاہی میں شریک کرنا چاہتا ہے۔ آپ اپنے بچوں کی گھٹی میں یہ بات ڈال دیں کہ دنیا قائم رہنے کے لئے بنی ہے۔ دنیا خوشی اور ساز و آواز کا گہوارہ ہے۔ آپ اپنے نونہالوں میں یہ طرزِ فکر

مستحکم کر دیں کہ اللہ سراپا محبت ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا میں محبت کے گیت گائے جائیں۔ اگر ہماری مائیں، ہماری بہنیں، ہماری بیٹیاں اپنی اولاد میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی بتائی ہوئی خلوص، محبت اور ایثار کی طرزِ فکر منتقل کر دیں تو دنیا پر چھائے ہوئے خوف و ہراس کے بادل چھٹ جائیں گے۔ معاشرہ سُدھر جائے گا۔ دولت کو سب کچھ سمجھنے والے لوگوں کی ذہانت زنگ آلود ہو جائے گی اور نوعِ انسانی پھر سے منزل کی طرف گامزن ہو کر اُس دنیا کا سراغ پائے گی جو مسرّت ہے، خوشی ہے، انبساط ہے اور محبّت ہے۔

شاہکار تصویر

فرض کیجئے کہ :

آپ ایک مصوّر ہیں اور تصویرکشی سے متعلق اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ ایک تصویر بناتے ہیں۔ یہ تصویر آپ کی زندگی کے ماہ و سال اور شب و روز کا حاصل شاہکار ہے۔ تصویر پوری ہونے کے بعد آپ جب اُسے دیکھتے ہیں تو آپ خود اس کے اُوپر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرا کوئی شخص جب اس تصویر کو دیکھے تو اس کی تعریف کرے۔

آپ نے ایسی زندہ جاوید تصاویر دیکھی ہوں گی کہ جن کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ تصویر ابھی اپنے کاغذی پیرہن سے نکل کر ہم کلام ہو جائے گی۔

یہ بات کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ بارہ سال کا عرصہ گزرا ہوگا کہ میں خالی الذہن تھا یکسوئی اس مقام پر تھی جہاں آدمی کسی ایک نقطہ پر مرکزیت حاصل کر کے ماحول سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

اخبار میں چار رنگوں سے چھپی ہوئی بہت خوبصورت تصویر کے خدوخال شعور کی سیڑھیاں پھلانگ کر جب لاشعور کے کمپیوٹر (COMPUTER) میں داخل ہوئے تو خیال نے کروٹ لی۔ جیسے ہی خیال نے کروٹ بدلی، ارادہ متحرک ہو گیا اور ارادہ نے چاہا کہ کاغذی پیرہن پہنی ہوئی تصویر کے نقش و نگار — غزالی آنکھیں، گلاب کی

پنکھڑیوں جیسے ہونٹ، کتابی چہرہ، چہرہ پر شفق رنگ گلدستہ کی طرح ناک اور سراپا سراپا جس آدمی کے ذہن سے اس کاغذ پر منتقل ہوا ہے اس آدمی کے اندر قدرت نے تخلیقی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔

اس سوچ نے میرے اندر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ تخلیقی صلاحیتوں کو متحرک کر دیا۔ اور تصویر کاغذ کے اندر سے نکل کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

اور پھر جس طرح کاغذی بساط سے اُتری تھی اسی طرح اپنے پیروں سے چل کر کاغذ کے اندر جذب ہو گئی۔

اس حقیقت سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ کاغذ کے اوپر تصویری خدوخال، نقش و نگار، حُسن، کشش، جذب، گداز، شگفتگی سب جاندار ہیں۔ اور جب تخلیقی اختیارات ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر ارادہ بن جاتے ہیں تو یہ نقش و نگار شکل و صورت اختیار کر کے ایک جسم بن جاتے ہیں۔

تصویر بنانے والا فن کار جب کوئی اپنا شاہکار تخلیق کرتا ہے تو در اصل اس کی روح کے اندر موجود تخلیقی فارمولے (EQUATION) متحرک ہو کر مظہر بن جاتے ہیں۔ یہ تصویرکشی ایک ایسے فن کار نے کی ہے جو خود تخلیق ہے۔

اللہ تعالیٰ بھی ایک مصوّر ہے۔ وہ بھی ایسی تصویرکشی کرتا ہے کہ خود اپنی شان میں قصیدہ کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

" اللہ وہ ہے جس نے ماں کے پیٹ میں تصویر بنائی اور سبحان اللہ کیا تصویر بنائی۔ " (قرآن)

اگر مصوّر سے یہ کہا جائے کہ وہ تصویر کے پرندے اُڑا دے تو ... جیتے خدوخال کو

مسخ کر دے یا جس کینوس (CANVAS) یا جس کاغذ پر تصویر بنائی ہے اُس کو پھاڑ دے، مصور کے لئے اس سے بڑی رنج اور تکلیف کی کوئی بات نہیں ہوگی اور وہ کبھی اپنی شاہکار تصویر کو خراب نہیں ہونے دے گا اور نہ اس کا خراب ہونا، اس کا مسخ ہونا اُسے پسند آئے گا۔

اللہ نے ایک تصویر بنائی، ایسی خوبصورت تصویر جو اپنے توازن، اعتدال، معین معتداروں، رنگ و رُوپ، جذب و کشش اور حُسن کے معیار میں منفرد ہے، یکتا ہے، بے مثال ہے۔ یہ تصویر دیکھتی بھی ہے، سنتی بھی ہے، بولتی بھی ہے، محسوس بھی کرتی ہے اور دوسروں کا دکھ درد بھی بانٹتی ہے۔ اگر کوئی بندہ اس تصویر کو داغ داغ کرنا چاہے اور اپنے ظلم و جہالت سے تصویر کو خراب کر دے تو یقیناً یہ بات سب سے بڑے مصور اللہ کے لئے نہایت ناپسندیدہ عمل ہے۔

تمام آسمانی کتابوں میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالےٰ حقوق العباد معاف نہیں کرتے۔ جب ہم حقوق العباد کا تذکرہ کرتے ہیں تو پہلے خود بندے پر اپنا حق عائد ہوتا ہے اس لئے کہ بندہ پہلے خود بندہ ہے۔

موجودہ ترقی یافتہ دور میں جس کو آسمانی علوم کے مطابق بلاشبہ عدم تحفظ، بے سکونی، انتشار اور پیچیدہ مسائل کا تنزل یافتہ دور کہا جا سکتا ہے، ہر آدمی سونے کے سکوں کا ذخیرہ کرنے کے لئے اپنی حق تلفی کر رہا ہے، اپنے جسم و جان کو تباہ کر رہا ہے۔ جیسے جیسے بندے کے اندر دنیا کا لالچ اور ہوسِ زر بڑھ رہی ہے اسی مناسبت سے اس کے اندر سے سکون، راحت اور اطمینانِ قلب ختم ہو رہا ہے۔ سکون اور اطمینانِ قلب سے محرومی، دماغی کشمکش، ذہنی کشاکش اور اعصابی تناؤ کا پیش خیمہ ہے

اعصابی تناؤ آدمی کے اندر ڈر اور خوف مسلط کر دیتا ہے۔ زندگی میں غم اور خوف کی آمیزش آدمی کی تصویر کو بدصورت، بدمست اور مسخ کرتی رہتی ہے۔

ہائے، یہ کیسی نادانی ہے کہ آدم زاد ہوسِ زر میں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی من موہنی خوبصورت تصویر کو خراب کر رہا ہے، ضائع کر رہا ہے، تباہ کر رہا ہے۔ سونے چاندی کے سکے اللہ تعالیٰ نے اس لئے نہیں بنائے کہ یہ سکے آدمی کی زندگی کو دیمک بن کے چاٹ جائیں۔ سونے چاندی کے سکوں کا مصرف یہ ہے کہ آدمی ان سے استفادہ کر کے اللہ کی بنائی ہوئی تصویر کے لئے زیب و زینت کا سامان مہیا کرے۔ لیکن موجودہ دور کا المیہ یہ ہے کہ آدمی یہ ثابت کرنے پر بضد ہے کہ سونے چاندی کے سکے آدم کے لئے نہیں بلکہ آدمی سونے چاندی کے سکوں کی بھینٹ چڑھنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ یہی وہ طرزِ فکر ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

"اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے لئے خرچ نہیں کرتے اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

یہ کیا کم عذاب ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ آدمی سینکڑوں سال زندہ رہ کر دنیا کی رنگینی میں اپنا کردار ادا کرے اور آدمی کام، کام، صبح کام، شام کام اور ہائے دنیا ہائے دنیا کے ختم نہ ہونے والے چکر میں خود اپنے ارادہ اور اختیار سے زندگی کو مختصر ترین کرنے پر تلا ہوا ہے جبکہ آدم و حوا کی اولاد یہ جانتی ہے کہ زندگی کو ایندھن بنا کر جمع کی جانے والی ساری پونجی ایک دن موت ہم سے چھین لے گی۔

●●●

تین دوست

لُو کے تھپیڑوں سے بچنے کے لئے کھڑکیوں اور دروازوں پر دبیز پردے ڈال کر کمرے میں اندھیرا کیا تو سکون ملا۔ اور جب اس اندھیرے میں پنکھے کے پروں کو ارتعاش ملا تو ٹھنڈک کا احساس ہوا اور خمار کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کمرے میں ہم چار دوست موجود تھے۔ ایک صاحب صوفے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ دوسرے صاحب گوتم بدھ کی نشست میں کمر سیدھی کئے ہوئے نہ جانے خلا کے اس پار کہاں گم تھے۔ تیسرے صاحب کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ اور کمرے میں موجود چوتھے صاحب کی ہیئت کذائی یہ تھی کہ جسم پر سوائے لنگی کے کچھ نہ تھا۔ سماں ایسا تھا کہ جیسے کمرے کا ماحول ایک نقطے پر ٹھہر گیا ہو۔ گو کہ چاروں حضرات نشست اور سوچ کے اعتبار سے الگ الگ اپنے اپنے خیال میں مگن تھے مگر سب میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ مشترک چیز یہ تھی کہ ان کی آنکھوں میں تفکر کے دیئے جل بجھ رہے تھے۔ چاروں میں سے ایک نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

"دوستو! دوست کی تعریف کیا ہے اور سب سے بہتر دوست کون ہے؟"

وہ صاحب جو گوتم بدھ کی نشست میں خلا میں گھور رہے تھے، اس سوال سے چونک پڑے اور انہوں نے کہا: "سب سے بہترین دوست انسان کا اپنا من ہے۔ جس نے من کو سمجھ لیا اور من کے اندر اپنی صورت کو دیکھ لیا، وہ دوست سے واقف

ہوگیا۔ یعنی وہ خود اپنا دوست بن گیا۔"

تیسرے صاحب نے جو مطالعہ میں مصروف تھے، کتاب کے اوپر سے نظر ہٹا کر پوچھا: "کسی کے لئے خود اپنا دوست بننا کیسے ممکن ہے؟"

صوفے پر بیٹھے ہوئے صاحب بھی اس گفتگو میں شریک ہوگئے اور یوں گویا ہوئے "خود اپنا دوست بننا اس طرح ممکن ہے کہ آدمی اپنے من سے واقف ہوجائے۔ جب تک ہم زندگی کو محض جسمانی تقاضے پورے کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں من اور رُوح سے دُور رہتے ہیں۔ اور جب ہم جسمانی تقاضوں کی سطح سے بلند ہو کر سوچتے ہیں تو ہمارے اُوپر رُوح اور رُوح کی حقیقتوں کے دروازے کُھل جاتے ہیں۔"

موضوع اتنا گمبھیر تھا کہ نقش و نگار سے آراستہ اندھیرے اور ٹھنڈے کمرے میں موجود چاروں حضرات اپنی پوری علمی توانائیوں کے ساتھ اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ سوال یہ اٹھا کہ من اور رُوح اور جسم میں کیا فرق ہے۔ اگر جسم نہ ہو تو رُوح کے تقاضے کیا معنی رکھتے ہیں۔ اور اگر رُوح نہ ہو تو جسم کی حیثیت صفر رہ جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ من اور رُوح کا رشتہ حقیقی رشتہ ہے اور جسم کا رشتہ فانی اور غیر حقیقی رشتہ ہے کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ہم پہلے جسم کو جانتے ہیں، پھر رُوح سے واقف ہوتے ہیں اور رُوح سے جس قدر واقف ہیں اس کی حیثیت محض علمی ہے، مشاہداتی نہیں ہے۔ جب کہ جسم کی حیثیت علمی بھی ہے اور مشاہداتی بھی۔

لنگی پوش بہت دُور کی کوڑی لائے۔ ذرا بلند اور گرج دار آواز میں بولے۔

"جسمانی وجود کا انحصار رُوح پر ہے۔ رُوح کا انحصار جسمانی وجود پر نہیں ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ رُوح کے بغیر آدمی کی حیثیت ایک لاش کے علاوہ کچھ نہیں۔ جب تک

رُوح گوشت پوست کے وجود سے تعلق قائم رکھتی ہے، گوشت پوست کے وجود میں حرکت موجود رہتی ہے، یہ گوشت پوست کا وجود دیکھتا بھی ہے، سنتا بھی ہے، چھوتا بھی ہے، بولتا بھی ہے، تپش اور ٹھنڈک کی لہروں کو محسوس بھی کرتا ہے لیکن اگر رُوح اس گوشت پوست کے وجود سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے تو یہ جسمانی وجود نہ سنتا ہے، نہ بولتا ہے، نہ محسوس کرتا ہے۔ رُوح کی موجودگی میں جسم کے کسی عضو پر سوئی کی نوک رکھ دی جائے تو آدمی چبھن محسوس کرتا ہے اور رُوح کی عدم موجودگی میں کسی بڑے دھاردار ہتھیار کی مدد سے جسم کا ایک ایک عضو کاٹ دیا جائے، الگ کر دیا جائے تو وجود کچھ بھی محسوس نہیں کرتا اور نہ اس کے اندر کوئی قوتِ مدافعت ہوتی ہے۔ زندگی کے اس عمل سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان کی اصل رُوح ہے، گوشت پوست کا وجود نہیں ہے۔ اگر کوئی بندہ اپنے من، اپنی رُوح سے واقف ہے تو وہ اپنا دوست ہے اور اس کے برعکس اگر کوئی بندہ صرف اپنے گوشت پوست کے وجود کو سب کچھ سمجھتا ہے تو وہ اپنا دشمن ہے۔ جس شخص کے اندر رُوحانی زندگی کا کوئی تصور موجود نہ ہو من اس کا دشمن ہے۔ اگر کوئی بندہ من سے کوئی کثیف کام لینا چاہتا ہے تو من اس کی خدمت کرنے سے انکار نہیں کرتا۔ وہ اُسے مادیت اور ٹائم اسپیس کے جال میں جکڑ دیتا ہے اور اگر کوئی بندہ من سے رُوح کا سراغ چاہتا ہے تو من اُسے ایک اچھے اور مخلص دوست کی طرح روحانی رشتوں سے متعارف کرا دیتا ہے اور من اُسے نہ صرف بتا دیتا ہے بلکہ دکھا بھی دیتا ہے کہ رُوح پاک ہے، جسم کثیف ہے۔ اس کے اُوپر یہ بات بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ جسم کی ساری خوشیاں جسم کی طرح عارضی ہیں اور رُوح چونکہ خود مستقل خوشی ہے، اس لئے روحانی لوگ خوش رہتے ہیں۔ خوف اور غم کے سائے ان سے دور بھاگ جاتے ہیں۔ یہ مادی دنیا اور گوشت پوست کے جسم کی دُنیا دوئی کی

دنیا ہے۔ ابھی ہم سکھی ہیں اور ابھی ہم دکھی ہیں۔ جو بات ہمارے لئے عزت کا باعث ہے وہی بات لمحہ بھر بعد ہمارے لئے بے عزتی بن جاتی ہے۔ دوئی کی اس مادی دنیا میں کسی چیز کو سمجھنا اسی وقت ممکن ہے جب ہم سُکھ، دکھ، عزت، بے عزتی، سردی اور گرمی کے تضاد کو سمجھ لیں۔ جب تک مجھے یہ علم نہیں کہ ذلت کیا ہے، عزت کا مفہوم میرے ذہن میں نہیں آتا۔ جب تک میں مصیبت کی چکی کے دو پاٹوں میں نہیں پستا، میں خوشی کو نہیں سمجھتا۔ اس تضاد سے گزرنے کے لئے مادی دنیا کی دوئی سے خود کو آزاد کرنا ہوگا جب کوئی شخص مادی دنیا کی اس دوئی سے گزر کر خود شناسی کے علم کا طالب بن جاتا ہے تو وہ ہر چیز کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے خواہ وہ کنکر ہوں، پتھر ہوں یا سونا ہو۔ اور جب تک کوئی بندہ خود شناسی کے علم سے ناواقف رہ جاتا ہے اس کا من بے چین اور بے قرار رہتا ہے۔ من کی بے چینی اور بے قراری دُور کرنے کے لئے ایک مخصوص طرزِ فکر کو اپنانا ضروری ہے اور یہ طرزِ فکر آزاد طرزِ فکر ہے۔"

ٹنگی پوش نے کہا کہ یہ آزاد طرزِ فکر دراصل قلندر شعور ہے۔ من سے دوستی کا رشتہ مستحکم کرنے کے لئے قلندر شعور ہمیں راستہ دکھاتا ہے اور وہ راستہ یہ ہے کہ یہاں ہمارا نہ کوئی دشمن ہے نہ کوئی دوست ہے۔ ہم خود ہی اپنے دوست ہیں، خود ہی اپنے دشمن ہیں۔ قلندر شعور جب حرکت میں آجاتا ہے تو بندہ یہ دیکھتا ہے کہ ساری کائنات ایک اسٹیج ڈرامہ ہے۔ اس اسٹیج پر کوئی باپ ہے، کوئی ماں ہے، کوئی بچہ ہے، کوئی دوست ہے، کوئی دشمن ہے، کوئی گناہگار ہے، کوئی پاکباز ہے۔ دراصل یہ اسٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کے مختلف رُوپ ہیں۔ جب ایک کردار یا سب کردار اسٹیج سے اتر جاتے ہیں تو سب ایک ہو جاتے ہیں اور ان کے اوپر سے دنیا کی دوئی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔

نورانی چہرے

قلندر شعور بیدار ہوا تو ــــــــ

عالمِ غیب و شہود میں ایک دانائے راز سے ملاقات ہوئی گوکہ یہ دانائے راز گوشت پوست اور ہڈیوں کے پنجرے پر گوشت پوست کے تانے بانے سے مرکب نہیں تھا لیکن اس ماورائی جسم میں ٹھوس نظر آیا اور گوشت پوست کے ہاتھوں نے جب اس کے گوشت پوست سے آزاد ماورائی ہاتھوں سے مصافحہ کیا تو لمس میں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ ماورائی ٹھوس جسم سے جب ذہنی ہم آہنگی ہوئی تو شعور اس دانائے راز ہستی سے مانوس ہوگیا۔

سوال کیا: اللہ تعالےٰ کون ہیں، کیسے ہیں، کیا کرتے ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟

دانائے راز کی نیم کھلی، مخمور آنکھوں پر پلکوں میں حرکت پیدا ہوئی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ چہرے پر عرفان و آگاہی کا تاثر گہرا ہوگیا۔ میرے سوال کے جواب میں اس مردِ آگاہ نے سوال کیا۔ "اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کرنے کے بعد ان میں توازن قائم کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا تم خود کو جانتے ہو؟"

ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب میرے پاس کچھ نہ تھا۔

دانائے راز ہستی نے کہا: "آسمانی رفعتوں سے زمین کی طرف دیکھو ـــ!"

میں نے دیکھا کہ زمین میں ایک ننھا سا بیج ڈالا گیا ہے۔ زمین نے ماتا کے

جذبات سے بے تاب ہو کر اس بیج کو اپنے پیٹ میں محفوظ کر لیا اور اپنی تخلیقی صلاحیتیں اس بیج میں منتقل کر دیں۔ دیکھا کہ زمین سے ایک ننھا سا پودا پھوٹا یا یوں کہیں کہ بیج کے دو پرت نہایت نرم و نازک دو پتے بن کر نمودار ہوئے۔ جڑ اس قدر کمزور ہے کہ براہِ راست زمین سے غذا حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ ننھا سا پودا بیج سے نکلے ہوئے دو پتوں سے اپنی غذا حاصل کر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ جڑ ذرا مضبوط ہوئی اور اس کے اندر اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی کہ وہ براہِ راست زمین سے غذا حاصل کر سکے۔ جیسے ہی یہ صلاحیت بیدار ہوئی بیج کے دونوں پرت جھڑ گئے۔ اب پودے نے زمین سے براہِ راست غذا حاصل کرنی شروع کر دی۔ شب و روز اور ماہ و سال کے اس عمل نے اس ننھی سی جڑ کو ایک تناور درخت بنا دیا۔ ایسا درخت جو زمین سے بھی غذا حاصل کرتا ہے اور فضا سے بھی روشنیوں کے ذریعے اپنے وجود کو برقرار رکھتا ہے۔

آدم زاد جب ماں کے پیٹ میں منتقل ہوا تو اس کی پیدائش میں بھی یہی تخلیقی عوامل نظر آئے۔ ماں کے پیٹ میں آدم زاد کے لئے گیہوں کی روٹی تھی اور نہ کسی قسم کا پھل تھا اور نہ ہی وہاں باورچی خانہ کا کوئی انتظام تھا۔ آلاتِ ہضم اتنے کمزور اور نحیف تھے کہ آدم زاد ان غذاؤں کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ ماں کے اندر تخلیقی صلاحیت نے ماں کے سینے کو دودھ جیسی صاف، زود ہضم اور لطیف غذا سے بھر دیا اور جب بچہ نمودار ہوا تو دودھ کے دو چشمے ابل پڑے اور جب اس چشمے کی ضرورت باقی نہیں رہی تو یہ چشمے سوکھ گئے۔

یہ ایک ایسا نظام ہے جو ازل سے جاری ہے۔ اور ابد تک قائم رہے گا۔

مردِ دانائے راز نے اپنی مخمور اور غزالی آنکھیں میرے اوپر مرکوز کر دیں۔ مجھے نظر آیا کہ اس کی آنکھوں کے اندر سے لہریں نکل کر میرے دماغ میں جذب ہو رہی ہیں۔ جب جذب

ہوتی ہوئی لہروں کے ذخیرے سے دماغ معمور (OVERFLOW) ہوگیا تو یہ لہریں باہر نکلنے لگیں۔ یہ لہریں ایک سیال چیز نظر آئیں۔ تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آئی کہ یہ لہریں پانی ہیں۔ دانائے راز نے سیدھے ہاتھ کی انگشتِ شہادت دونوں نتھنوں کے بیچ میں ناک کی جڑ پر رکھی۔ یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ موجودات میں ہر چیز کی بنا (BASE) پانی ہے جو ایک پائپ کے ذریعے صعود اور نزول میں رواں دواں ہے۔ ماں کے پیٹ میں یہی پانی شکل بدل کر ایک پائپ کے ذریعے بچے کی غذا بنتا ہے۔ پھر یہی پانی دودھ بن جاتا ہے، آم کے درخت میں آم، بیر کے درخت میں بیر، سیب کے درخت میں سیب اور کیلے کے درخت میں کیلا بنتا رہتا ہے۔ یعنی میٹر یا مادّہ ایک ہے اور مختلف درختوں میں جا کر مختلف صورت میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ یہی پانی کبھی ایک رنگ پھول بن جاتا ہے اور کبھی ایک پھول میں بے شمار رنگ بن جاتا ہے۔

قرآن میں ہے:

اور وہی ذات بابرکت ہے جو آسمان سے پانی نازل کرتی ہے اور
پانی سے قسم قسم کے پھل اور طرح طرح کی نوعوں کو وجود میں لاتی ہے۔

یہی پانی کسی خول کو خدوخال کے ساتھ خوبصورت بناتا ہے اور یہی پانی کسی خول کو بدصورت بنا دیتا ہے۔ پانی کی یہ کارفرمائی اتنی گہری اور عمیق ہے کہ اس کو سمجھنا دراصل نظامِ کائنات کا عرفان حاصل کر لینا ہے۔

تخلیق کے اس نظام پر غور کرنے والے لوگ یہ جان لیتے ہیں کہ کائناتی تخلیقی پروگرام ایک رشتہ میں منسلک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ موجودات میں دو نوعیں، انسان

اور جن اس نظام کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ باقی نوعیں اس نظام کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔ یہ نوعیں اس نظامِ کائنات کو سمجھنے کی اہل اس لئے نہیں ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالےٰ کی پیش کردہ امانت کو قبول نہیں کیا۔ اور آدم زاد اس پرپیچ نظام کو اس لئے سمجھنے کی قدرت رکھتا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی پیش کردہ امانت کو قبول کر لیا۔ اس بات کو قرآن یوں بیان کرتا ہے:

اور ہم نے اپنی امانت پیش کی سماوات کو، زمین کو، پہاڑوں کو لیکن
سب نے اس بات کا اعلان کر دیا کہ ہم اس امانت کے متحمل نہیں
ہو سکتے اور انسان نے بغیر سوچے سمجھے اس امانت کو قبول کر لیا۔ بیشک
یہ ظالم اور جاہل ہے۔

ظلم اور جہالت یہ ہے کہ آدم کے پاس اللہ تعالےٰ کی وہ امانت موجود ہے جس امانت سے کائنات کی ساری مخلوق محروم ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ آلِ عمران میں فرماتے ہیں:

وہ دن آ کر رہے گا جب بعض چہرے نورانی ہو جائیں گے اور بعض
تاریک۔ سیاہ رُو لوگوں سے کہو کہ تم نے اللہ کو تسلیم کرنے کے بعد
اس کے احکام سے انحراف کیا، اب اس بدکاری کی سزا بھگتو اور باقی
وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی امانت قبول کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی
خوشنودی کو ہر چیز سے زیادہ مقدم رکھا، ان کے چہرے نورانی ہوں گے
اور ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی دائمی رحمت نازل ہوتی رہے گی۔

●●●

آدم وحوا

خدا جب سورج کی شعاعوں کے ڈول سمندر میں ڈالتا ہے تو سورج پانی کے ذرات سے ان بھرے ہوئے ڈولوں کو فضائے بسیط میں بکھیر دیتا ہے، وہاں ایک پروسس کے تحت پانی کے یہ ذرات بادل بن کر زمین پر برستے ہیں اور اس طرح پوری زمین سیراب ہوتی رہتی ہے۔ آدم کو جب زمین پر پھینکا گیا تو اس نے شکوہ کیا کہ میں اپنی غذائی ضرورتیں کہاں سے پوری کروں گا۔ اللہ نے کہا زمین کو ہم نے تمہارے لئے وسائل کا ذخیرہ بنا دیا ہے۔ زمین کی کوکھ کھولو۔ تمہیں تمہاری ضروریات کی ساری اشیا فراہم کر دی جائیں گی۔ آدم نے اپنے رب کے فضل سے زمین کو کریدا اس میں سے ضروریات کی تمام چیزیں اُسے میسر آگئیں۔ کلیہ یہ ہے کہ جو شخص جیسی محنت کرتا ہے، ویسا ہی پھل اُسے مل جاتا ہے۔ آدم اور اس کی زوجہ حوا جنت میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن یکسانیت سے گھبرا کر وہ ایسی غلطی کر بیٹھے جس کی پاداش میں جنت نے انہیں رد کر دیا۔ بلاشبہ جنت ایک مخصوص کردار کا گنجینہ ہے اور جب اس مخصوص کردار میں ٹوٹ پھوٹ واقع ہو گئی تو آدم و حوا کا مسکن زمین بن گئی۔

یہ دنیا دوئی کی دنیا ہے۔ دنیا کا کوئی ایک کردار بھی اس دوئی سے آزاد نہیں ہے۔ موسم کا گرم و سرد میں تبدیل ہونا، خوشی کے اوپر غم کا سایہ اور غم کے اوپر خوشی کا غلبہ، عزت، لمحہ بھر بعد بے عزتی، صحت، بیماری، محبت اور نفرت، نفرت اور محبت، رات کا دن میں سے نکلنا اور دن کا رات میں داخل ہونا ــــ یہ سب دوئیاں دراصل ہر کردار کا متضاد پہلو ہے۔ دوئی کی دنیا میں جب تک اس تضاد کو نہیں سمجھا جائے گا کسی چیز کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

جب تک میں ذلت کو نہیں سمجھتا، میرے لئے یہ سمجھنا کہ عزت کیا ہے ایک مفروضہ عمل ہے۔ اسی طرح اگر میں نہیں جانتا کہ مصیبت کیا ہے تو خوشی کا تذکرہ میرے لئے بے معنی بات ہو گی۔

جب ہم اس دوئی کی دنیا کے بارے میں سوچتے ہیں تو ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دوئی کا تعلق جسم سے ہے۔ جب تک جسمانی تحریکات موجود ہیں، دوئی بھی موجود ہے۔ خوشی غم، بیماری صحت، گرمی سردی، نفرت محبت، خود غرضی اور اخلاص کا تعلق جسم کے ساتھ ہے۔ جسم بھی دوئی کے اوپر قائم ہے۔ ایک مٹی کے ذرات سے بنا ہوا جسم، دوسرا جنت کی روشنیوں سے بنا ہوا جسم۔ مٹی کے ذرات سے بنا ہوا جسم مادی جسم ہے اور جنت کی روشنیوں سے بنا ہوا جسم رُوحانی جسم ہے۔ انسان روحانی اور مادی جسم کی دوئی میں زندگی گزارتا ہے۔ جسمانی پابند تصورات سے نجات پانے کے لئے مادی جسم سے نہیں، جسمانی تصورات سے نجات پانا ضروری ہے۔ مادی جسم کو اس طرح تربیت دینا ہو گی کہ وہ ان دوئیوں کو ایک ساتھ قبول کرے۔ خوشی اور مصیبت کی دوئی صرف مادی جسم کی وجہ سے ہے۔ لیکن اگر آدمی کے اندر قلندر شعور متحرک ہو جائے تو تمام دوئیاں موجود رہنے کے باوجود بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اور کبھی عارضی طور پر معدوم بھی ہو جاتی ہیں۔

زندگی گزارنے کی ایک طرز یہ ہے کہ آدم زاد ہمہ وقت، ہر آن اور ہر لمحہ پابند حواس کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ زندگی گزارنے کی دوسری طرز یہ ہے کہ آدم زاد

پابند ہو اس کے ساتھ بھی آزاد زندگی گزارتا ہے۔ حزن و ملال کے تاثرات اُسے متاثر نہیں کرتے۔ وہ خوش بھی نہیں رہتا کہ خوشی کے ساتھ دُوسرا رُخ غم چپکا ہوا ہے۔ زمین کے اوپر وسائل کی چکا چوند اس کی آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی کہ زمین سے دُور، بہت دُور اعلیٰ زمین، جنّت اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے۔ جس طرح مادّیت میں قید وہ یہاں روٹی کھاتا ہے، اسی طرح مادّیت سے آزاد ہو کر جنّت کے باغات سے انگور کے خوشے حاصل کرنا اس کے لئے آسان ہے۔ جب کوئی شخص دوئی سے واقف ہو کر خود شناسی میں مکمل ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر زندگی کی ایک نئی راہ، نئی طرز اور نیا اسلوب منکشف ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو قلندر شعور کا حامل مردِ آزاد کہا جاتا ہے۔ مردِ آزاد ہر چیز کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے خواہ وہ پتھر ہو یا سونا ہو۔ مردِ آزاد جب یہ جان لیتا ہے کہ میں صرف جسم نہیں ہوں تو اپنی جسمانی ضروریات کو ہی زندگی نہیں سمجھتا۔ اس کے سامنے زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد ہوتا ہے اور وہ ظاہر و باطن اس بات کا مشاہدہ کر لیتا ہے کہ یہ دنیا عارضی اور ایک فکشن (FICTION) ہے۔ اس کا دل پُرسکون رہتا ہے۔ وہ مادّی دنیا سے متاثر ہو کر منتشر نہیں ہوتا۔ مادّی چمک دمک سے وہ خوش تو ہوتا ہے لیکن یہ چمک دمک اس کے لئے کشش نہیں بنتی۔

قلندر شعور کے حامل آزاد انسان کی نظر میں خیر خواہ دوست اور دشمن، رشک و حسد کرنے والے، پاکباز اور پاپی، بے لوث اور خود غرض، جانب دار اور غیر جانبدار سب کی حیثیت یکساں ہو جاتی ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ ہم صرف جان دار اشیا ہیں اور کائنات جاندار اشیا کے لئے ایک اسٹیج ہے۔ کائنات میں ہر فرد اپنا اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ کائنات دراصل ایک بڑے ڈرامے کی طرح ہے جس میں ہر فرد اپنا

کردار ادا کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔

کائنات ایک ہے۔ اس کے ڈرامائی کردار مختلف ہیں۔ کوئی کردار ظالم ہے اور کوئی کردار مظلوم ہے۔ کسی کے سپرد امن و آشتی کا پیغام دینا ہے اور کسی کو اس بات پر متعین کر دیا گیا ہے کہ وہ تخریب کاری کا پرچار کرے۔

جس طرح ایک فلم سینکڑوں ہزاروں اسکرین پر دیکھی جا سکتی ہے اسی طرح کائنات کی تمثیل لوحِ محفوظ سے ڈسپلے (DISPLAY) ہو رہی ہے۔ کائنات میں موجود ہر زمین ایک اسکرین ہے۔ قلندر شعور بیدار ہو جاتا ہے تو یہ ساری کائنات ایک فلم اور کائنات میں کھربوں زمینیں اسکرین نظر آتی ہیں۔ اندر کی آنکھ گوشت پوست کی آنکھ کو دکھا دیتی ہے جو کچھ اس زمین پر ہو رہا ہے، جس طرح اس زمین پر کھیتی باڑی ہو رہی ہے، شادی بیاہ کی تقریب کے بعد ایک نسل سے دوسری نسل وجود میں آ رہی ہے۔ بالکل اسی طرح کائنات میں موجود دوسری تمام زمینوں پر بھی یہ نظام جاری و ساری ہے۔

●●●

محاسبہ

پیغامبر حضرت عیسٰی علیہ السلام ایک شہر سے دوسرے شہر تبلیغ کے لئے جارہے تھے کہ راستے میں انہیں ایک یہودی نے سلام کیا: "اے بندۂ خدا! اس سفر میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں۔"

دونوں مسافر چلتے چلتے جب تھک گئے اور سورج بھی نصف النہار پر آگیا تو یہودی نے تجویز پیش کی کہ دھوپ کی تمازت، بھوک اور پیاس کی شدت سے بچنے کے لئے کسی سایہ دار درخت کے نیچے ایک پہر گزار لیا جائے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام اور یہودی ایک درخت کے نیچے جا ٹھہرے۔ سورج کی جھلس دینے والی شعاعوں سے درخت نے جب تحفظ فراہم کیا اور اعصاب کو سکون ملا تو یہودی نے عرض کیا: "آیئے کھانا کھالیں۔" عیسٰی علیہ السلام اور یہودی نے ایک ساتھ اپنے اپنے دسترخوان کھولے۔ یہودی نے دیکھا کہ حضرت عیسٰیؑ کے دسترخوان میں دو روٹیاں تھیں اور یہودی کے پاس تین روٹیاں تھیں۔ یہودی نے حضرت عیسٰیؑ سے کہا: "میں عمر میں آپ سے بڑا ہوں، کھانے کے ساتھ پانی کا ہونا بھی ضروری ہے۔" حضرت عیسٰیؑ پانی لینے چلے گئے اور یہودی نے اپنی تین روٹیوں میں سے جلدی جلدی ایک روٹی کھالی۔ حضرت عیسٰیؑ پانی لے کر آئے اور دونوں مسافر کھانا کھانے بیٹھے تو حضرت عیسٰیؑ نے دیکھا کہ یہودی کے دسترخوان میں دو روٹیاں ہیں۔

انہوں نے کہا: "اے شخص! تیرے پاس تین روٹیاں تھیں۔ ایک روٹی کہاں گئی؟"

یہودی نے کہا: "آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔ میرے پاس دو ہی روٹیاں تھیں۔"

کھانا کھانے کے بعد یہودی قیلولہ کے لئے لیٹا اور سو گیا۔ حضرت عیسٰیؑ اٹھے اور ریت کی تین ڈھیریاں بنائیں۔ ان کے اوپر پھونک ماری تو وہ سونا بن گئیں۔ یہودی بیدار ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سامنے کچھ فاصلے پر سونے کی تین ڈھیریاں پڑی ہیں۔ اس نے نہایت تعجب اور بے یقینی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ حضرت عیسٰیؑ سے پوچھا: "یہ سونا کس کا ہے؟"

عیسٰیؑ نے فرمایا: "ایک میری ہے، ایک تیری ہے اور تیسری اس کی ہے جس نے تیسری روٹی کھائی۔"

یہودی فوراً بول پڑا: "وہ روٹی میں نے کھائی تھی۔" تھوڑی دیر کے بعد یہودی گویا ہوا: "اے حضرت! آپ نبی اللہ ہیں۔ آپ کو دنیا کی دولت سے کیا غرض، سونے کی یہ تیسری ڈھیری بھی مجھے دے دیں۔"

عیسٰیؑ نے کہا: "ایک شرط ہے۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ میرے اور تیرے درمیان ساتھ سفر کرنے کا جو معاہدہ ہوا تھا، تو اس کو ختم کردے تاکہ میں اپنی راہ لوں۔"

یہودی نے کہا: "ٹھیک ہے آپ تشریف لے جائیں میں تنہا سفر کروں گا۔"

حضرت عیسٰیؑ نے کندھے پر کمبل ڈالا اور درخت کے نیچے سے رخصت ہو گئے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں پہنچے تھے کہ یکایک تین آدمی نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک نے باآواز بلند یہودی سے کہا: "اے شخص! تو یہاں کیا کر رہا ہے، کیا تو ہمارے حق پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتا ہے؟"

یہودی نے یہ سن کر اس آدمی پر بہت لعن طعن کی مگر جب اس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو وہ منت و زاری کرنے لگا۔ مگر ان تین آدمیوں کے پاس یہ دلیل تھی کہ ہم تین ہیں اور یہ ڈھیریاں بھی تین ہیں۔ یہودی بہت رویا، بہت گڑگڑایا تو ان تینوں میں سے ایک نے جو سردار تھا، کہا: "ایک طریقہ ہے کہ تم ان تینوں میں سے ایک ڈھیری لے سکتے ہو"

یہودی چار و ناچار راضی ہوگیا۔ معاہدہ یہ طے پایا کہ یہودی بازار جا کر ان تینوں کے لئے کھانا لائے اور اس بات کی اطلاع پولیس کو نہ دے۔ یہودی نے بازار سے کھانا خرید کر اس میں زہر ملا دیا کہ وہ تینوں غاصب کھا کر مر جائیں اور سارے سونے پر اس کا قبضہ ہو جائے۔ اُدھر ان تینوں میں سے ایک نے یہ ترکیب سوچی کہ یہودی جیسے ہی کھانا لے کر آئے اُسے قتل کر دیا جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہودی کو قتل کر دیا اور تینوں کھانا کھا کر ہلاک ہوگئے۔

ہم جب اپنے معاشرے پر غور کرتے ہیں تو ہمارا ذہن وقت کی نفی کر کے، ۴۳ سال پہلے ماضی بعید پہنچ جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ایک دن میں مشرقی پنجاب کی ریاست پٹیالہ میں ایک وسیع و عریض، بلند و بالا حویلی میں مقیم تھا۔ ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔ مشین گن میں سے نکلنے والی گولیوں کی آواز سے شعور معطل اور اعصاب مضمحل ہو رہے تھے۔ جو بھی گھر سے باہر نکل رہا تھا اس کو موت اچک لیتی تھی۔ جو لوگ گھروں میں بند تھے، ان کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ قدرت کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ سات روز کی قید اور بھوک پیاس کی اذیت سے نجات ملی تو گھر والوں کو گھر سے باہر نکال دیا گیا۔ مجھے اس طرف سے اس طرف جانے کے لئے ایک سڑک عبور کرنا تھی۔ کچھ دیر ٹھہر کر، رُک کر، عالمِ خواب میں نہیں، عالمِ ہوش و حواس میں، میں نے یہ چاہا کہ سڑک اس طرح پار کر لوں کہ میرے قدم لاشوں کے اوپر نہ

پڑیں۔ مگر سڑک لاشوں سے اٹی پڑی تھی اور مجھے مجبوراً پنجوں کے بل لاشوں کے اوپر سے گزر کر سڑک کی دوسری طرف جانا پڑا۔ گھروں کی چھتوں پر سے خون بہہ رہا تھا۔ نالے خون آلود پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ بچے بلک رہے تھے۔ خواتین چادر اور چاردیواری سے آزاد عبرت کا مرقع بنی ہوئی تھیں۔ دولت کے انبار اور نوٹوں سے بھری ہوئی گٹھڑیاں مٹی سے بھی زیادہ بے وقعت ہوگئی تھیں۔

۱۴۔ اگست کا سورج جوں ہی افق سے نمودار ہوا، اس کی شعاعوں میں ایک پیغام تھا کہ ایک قوم دوسری قوم سے آزادی حاصل کر کے اپنی نسل کے لئے ایک فلاحی مملکت قائم کرے۔ بھوکی اور ننگی قوم پر قدرت نے اپنے خزانے کھول دیئے تاکہ قوم وسائل کی کمی کا شکوہ نہ کرے اور قوم کے فلاحی کاموں میں کوئی رخنہ انداز نہ ہو۔

ایک نسل ختم ہوگئی۔ ایک نسل جوان ہو کر بڑھاپے کی طرف گام زن ہے اور ایک نسل جوان ہو رہی ہے۔ تینوں نسلوں کو فرشتے ترغیبی پروگرام INSPIRE کرتے رہے مگر جیسے جیسے قدرت کا انعام عام ہوتا رہا، قوم کے اندر زر اور زمین کی ہوس بڑھتی گئی اور آج یہ حرص و ہوس قوم کے جسم کے لئے ناسور بن گئی ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دھرتی پر وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو اپنے ماضی کو یاد رکھتی ہیں اور حال میں کئے ہوئے اعمال کا محاسبہ کرتی ہیں۔

●●●

کیمرہ

خدا وہ ذات اور رب وہ ہستی ہے جو سب کے دل میں موجود ہے۔ جس طرح دل کی حرکت کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح خدا کے بغیر دل کی حرکت کا تصور بے معنی ہے۔ خدا سب کا دوست ہے اور ایسا دوست ہے جو بار بار ہر ہر جنم میں، پنگوڑے میں، لڑکپن میں، جوانی میں، بوڑھاپے میں ہمارے ساتھ رہتا ہے۔

باپ کے تخلیقی سیال مادہ کو جب ماں قبول کرتی ہے اور یہ دو قسم کے لعاب آپس میں تحلیل ہو جاتے ہیں تو جسم وجود میں آتا ہے اور ماں کے جسم کے مطابق وہ جسم ڈھلتا اور بڑھتا رہتا ہے اور ہڈیوں کے پنجرے پر گوشت کی دبیز تہوں کو جب اعصاب کی پٹیوں سے کس کر کھال کے پلاسٹر سے مزین کر دیا جاتا ہے تو جسم کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس مکمل شدہ جسم کو گرمی کے تھپیڑوں اور خنک ہوا لہروں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک بند کوٹھری میں تحفظ فراہم کیا جاتا ہے بلکہ جسم کی نشو و نما کے لئے ماں کے اندر دوڑنے والے خون کو ایک پائپ کے ذریعے اس وجود کی رگوں اور شریانوں میں دوڑایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس بند کوٹھری سے باہر آنے سے پہلے اس وجود کی نشو و نما کے لئے ماں کے سینے میں غذا کا ذخیرہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ نسلی سلسلہ کتے، بلی، شیر، بکری، اونٹ، گائے، گھوڑے، ہاتھی، دیگر چوپائے اور انسان میں ایک مسلسل، متواتر اور مشترک عمل ہے۔ بے شک سیال مادہ کی

اس منتقلی میں تخلیق کا راز چھپا ہوا ہے۔

دکھ سکھ کی زندگی گزارنے کے بعد جسم پر موت وارد ہو جاتی ہے۔ پھر یہی جسم ماں اور باپ کے جسم میں جلوہ گر ہو کر کسی باپ کی پشت اور کسی ماں کے بطن میں داخل ہو جاتا ہے اور اس طرح نئی نئی صورتیں عالم وجود میں آتی رہتی ہیں۔

نوعوں کے نسلی سلسلہ پر غور کیا جائے تو یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ باوجود مشترک قدروں کے ہر نوع کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ سننا، دیکھنا، محسوس کرنا، بھوک پیاس کا تقاضا سب میں مشترک ہے مگر پھر بھی ہر نوع اور ہر نوع کا ہر فرد ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

ہمارا دوست خدا، ہمیں اس تسلسل کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہے کہ ہمارا نسلی تشخص برقرار رہتا ہے۔ پیدائش کا عمل ایک ہونے کے باوجود کائنات کے ہر وجود کی اپنی ایک الگ شناخت ہے۔ جب ہماری زمین ماں "ہمارے دکھ سکھ ختم کرنے کے لئے ہمیں اپنی آغوش میں اس طرح سمیٹ لیتی ہے کہ مادی وجود معدوم ہو جاتا ہے تو خدا، ہمارا دوست ہمیں دوسری دنیا میں نسلی سلسلہ کے غلاف پیدا کر دیتا ہے۔ مرنے جینے کا یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔

میں خواجہ شمس الدین عظیمی ازل میں "کُن" کا ظہور بنا، لوح محفوظ کے کیمرے نے میری فلم بنائی اور یہ فلم برزخ کی اسکرین پر ڈسپلے (DISPLAY) ہوئی۔ برزخ کے پروجیکٹر نے خواجہ شمس الدین عظیمی کی اس فلم کو ڈسپلے کیا تو نسلی سلسلے کی مشین نے مقررہ پروسیس (PROCESS) کے تحت زمین کی اسکرین پر دکھا دیا۔ زمینی کیمرہ خواجہ شمس الدین عظیمی کا ایک ایک حرکت اور ایک ایک عمل کی فلم بناتا رہا۔ اور جب یہ فلم مکمل ہو گئی تو عالم اعراف کی سکرین

پر منتقل ہوگئی۔ عالم اعراف سے حشر و نشر اور حشر و نشر سے جنّت اور دوزخ تک یہ نظم نظر آتی رہی۔ اس مربوط نظام کو چلانے والا، تحفظ دینے والا کون ہے ـــــ ؟

ہمارا دوست خدا ہے !

ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ، متانت اور بُردباری کے ساتھ یہ سوچنا ہوگا کہ مرنے جینے اور جسم کی نت نئی تبدیلیوں کے پیچھے کیا عوامل کام کر رہے ہیں، کیوں یہ سلسلہ قائم ہے، ہم کیوں قائم بالذات نہیں ہوجاتے، کیا ہم بار بار تبدیلیٔ جسم کے سلسلے کو ختم کرسکتے ہیں اور کیا ہم بقائے دوام پاسکتے ہیں۔ اور کیا ہر آن اور ہر لمحہ جسمانی، ذہنی، شعوری تبدیلیوں سے نجات ممکن ہے ؟ ہمیں یہ تفکر کرنا ہوگا کہ اختلاف لیل و نہار کے ساتھ ساتھ ہم بھی کیوں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

یہ جاننے کے لئے ہمیں اپنے دوست خدا کو پہچاننا ہوگا اور جب ہم اپنے سچے، پاک اور ایثار کرنے والے دوست خدا سے واقف ہوجائیں گے تو ردّ و بدل کا یہ لامتناہی سلسلہ ایک نقطہ پر ٹھہر جائے گا۔

بچہ جب چھوٹا ہوتا ہے تو اپنے ماں باپ کو پیار کرتا ہے، پھر اپنے بہن بھائی کو اور جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے وہ اپنے کنبے، سماج، فرقے، ملک، قوم اور نوعِ انسان سے پیار کرنا شروع کردیتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کے اندر محبت اور پیار کی تشنگی باقی رہتی ہے۔ آج کا بچہ کل کا بوڑھا ہونے تک پیاسا ہی رہتا ہے۔ اور یہ تشنگی اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک وہ نہیں جان لیتا کہ سچا، بے غرض اور عظیم الشان محبوب کون ہے۔ سارے پیار کی پیاس اس وقت بجھ جاتی ہے جب ہم اپنے دوست خدا کو محبت کی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ ہماری محبت روشنی یا ہوا کی لہر بن جاتی ہے،

ایسی لہر جو سارے جہان میں پھیل کر محبت کی خوشبو بکھیر دیتی ہے۔

قلندر شعور اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے وہ یہ کہ جس طرح ہمارا دوست خدا ہم سے اور کائنات میں موجود ساری مخلوق سے محبت کرتا ہے ہم بھی اس کی مخلوق سے محبت کریں۔ جس طرح ہمارا دوست خدا مخلوق کے کام آتا ہے اسی طرح ہم بھی اس کی مخلوق کی خدمت کریں۔

●●●

قلندر بابا اولیاءؒ

جمعہ کی نماز کے بعد نمازی مسجد سے باہر آئے تو دیکھا ایک صاحب مذہبی لٹریچر تقسیم کر رہے تھے۔ لوگ اس لٹریچر کو حاصل کرنے میں کچھ ایسی بے صبری کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ لگتا تھا کہ شیرینی تقسیم ہو رہی ہے۔ میرے ہاتھ بھی ایک کتاب لگی جب میں وہاں سے چلا تو پیچھے سے ایک دوست نے آواز دی اور کہا آیئے کہیں چل کر بیٹھتے ہیں، اس مذہبی کتابچے پر بحث کریں گے۔ میں نے کہا بھائی، میں فقیر آدمی ہوں۔ مجھے بحث سے کیا کام، میرا مسلک انسانیت اور مخلوقِ خدا کی خدمت ہے۔ خدمت کرنے والا بندہ اختلافی مسائل میں نہیں الجھتا۔ لیکن دوست کے اصرار و زور زبردستی سے ہم دونوں ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔ دوست بولا کہ مذہب محض پابندی کا نام ہے، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو اور یہ پابندی بھی ایک ایسی ہستی سے منسوب کی جاتی ہے جو نظر نہیں آتی اس نظر نہ آنے کو آپ لوگ غیب کہتے ہیں۔ میں نے جان چھڑانے کے لئے ان سے بہت معذرت کی اور کہا میرے بھائی، مذہب اور غیب یہ دونوں عنوان ایسے ہیں جو یقین سے تعلق رکھتے ہیں اور یقین اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ مشاہدہ نہ بن جائے۔ جہاں تک اس ہستی کا تعلق ہے جس ہستی سے مذہب اور غیب کو منسوب کیا جاتا ہے وہ اس بات پر قدرت رکھتی ہے کہ جب چاہے اپنا مشاہدہ کرا دے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بحث کا آغاز ہو گیا اور مجھے قلندر بابا اولیاءؒ کی ٹیپ شدہ ایک بات یاد آ گئی۔

ابدالِ حق، حسن اخریٰ محمد عظیم برخیا قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں:

روحانیت میں لاتناہیت کی انا خصوصیت رکھتی ہے اور لازمانیت کی انا بھی تذکرے میں آتی ہے۔ روحانی اقدار سے متعلق جتنے علوم اب تک زیرِ بحث آئے ہیں، ان سب علوم میں کائنات جو مظاہر میں اہمیت رکھتی ہے وہ بعد کی چیز ہے۔ پہلے مخفی اور غیب کو زیرِ غور لایا جاتا ہے اور مخفی اور غیب ہی کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر مخفی اور غیب سمجھنے میں آسانی ہونے لگے تو مظاہر کس طرح بنتے ہیں، مظاہر کے بننے اور تخلیق ہونے کے قوانین کیا ہیں۔ یہ ساری باتیں آہستہ آہستہ ذہن میں آنے لگتی ہیں اور فکر ان کو اسی طرح محسوس کرتی ہے جس طرح بہت سی باتیں جو انسان کے تجربے میں نو عمری سے ہوش کے زمانے تک آتی رہتی ہیں۔ ان میں ایک خاص فکر کا ارتباط رہتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو جو غیب سے متعلق ہیں اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں بہت سے نام دیئے ہیں اور انبیا نے ان ناموں کا تذکرہ کر کے ان کے اوصاف کو عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ قرآن پاک سے پہلی کتابیں بھی ان چیزوں پر روشنی ڈالتی ہیں لیکن ان کتابوں میں جستہ جستہ تذکرے ہیں۔ زیادہ تفصیلات قرآن پاک میں ملتی ہیں۔ قرآن پاک کی تفصیلات پر جب غور کیا جاتا ہے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غیب مظاہر سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ غیب کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ مذہب یا دین جس چیز کو کہتے ہیں وہ غیب ہی کے BASE پر منحصر ہے۔ مظاہر کا تذکرہ مذہب میں ضرور آتا ہے لیکن ثانویت رکھتا ہے۔ اس کو کسی دور میں بھی اولیت حاصل نہیں تھی۔ مادی دنیا اسے کتنی ہی اولیت دے لیکن آہستہ آہستہ وہ بھی اسی طرز پر سوچنے لگی ہے مثلاً موجودہ دور کے سائنسداں بھی غیب کو اولیت دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ وہ کسی چیز کو فرض کرتے ہیں۔ فرض کرنے کے بعد پھر نتائج اخذ کرنے کی کوشش میں لگ

جاتے ہیں اور جب نتائج اخذ کرتے ہیں تو وہ ان تمام چیزوں کو حقیقی، لازمی اور یقینی قرار دیتے ہیں جیسا کہ بیسوی صدی میں الیکٹران کا کردار زیر بحث ہے۔ الیکٹران کے بارے میں سائنسدانوں کی ایک ہی رائے ہے کہ وہ بیک وقت AS A PARTCLE اور BEHAVE ،AS A WAVE کرتا ہے۔ اب یہ غور طلب ہے کہ جو چیز محض مفروضہ ہے وہ بیک وقت دو طرز پر عمل کرے اور اس کے عمل کو یقینی تسلیم کیا جائے۔ وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ الیکٹران کو نہ آج تک دیکھا گیا اور نہ آئندہ اس کے دیکھنے کی امید ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ الیکٹران کو اتنی ٹھوس حقیقت تسلیم کرتے ہیں جتنی ٹھوس کوئی حقیقت اب تک نوع انسانی کے ذہن میں آسکی ہے یا نوع انسانی جس حقیقت سے اب تک روشناس ہو سکا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ صرف مفروضہ ان کے ذہن میں ہے اور مفروضے سے چل کر وہ اس نتیجے پر ایسی منزل تک پہنچ جاتے ہیں جس منزل کو اپنے لئے ایجادات اور بہت زیادہ اہمیت کی اور کامیابی کی منزل قرار دیتے ہیں۔ اس اہم منزل کو وہ نوع انسانی کے عوام سے روشناس کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کئی تجربہ ایسا ہوتا ہے کہ جن حقائق کو وہ حقائق کہہ کر ایک مرتبہ پیش کر چکے ہیں، چند سال کے بعد یا زیادہ مدت کے بعد وہ ان حقائق کو رد کر دیتے ہیں اور رد کر کے نئے طور طور کے نئے فارمولے لے آتے ہیں اور ان نئے فارمولوں کو پھر انہی حقائق کا مرتبہ دیتے ہیں جن حقائق کا مرتبہ پہلے وہ ایک حد تک برسہا برس کسی بھی ایک رد شدہ چیز کو دے چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ غیب کی دنیا ان کے لئے اولیت رکھتی ہے حالانکہ وہ محض مادہ پرست ہیں اور خود کو مادیت کی دنیا کا پرستار کہتے ہیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا غیب کی دنیا کوئی چیز ہے یا کوئی اہمیت رکھتی ہے یا اس کے کوئی معنی ہیں یا قابل تسلیم ہے یا اس کو

نظر انداز کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس قسم کے تصورات جن کو مادیت کہنا چاہیئے ان کے اردگرد ہمیشہ جمع رہتے ہیں اور جب کبھی کسی غیب کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو وہ ہمیشہ ایک ہی مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک DEMONSTRATION نہ کیا جائے اس وقت تک ہم کسی غیب سے متعارف ہو سکتے ہیں اور نہ کسی غیب سے متعلق یقین کرنے کو اور یہ سمجھنے کو کہ غیب کوئی خبر ہو سکتا ہے ہم تیار ہیں یا یہ کہ ہم سائنس کی دنیا میں نظریۂ غیب کو یا غیب کے تذکرے کو کوئی جگہ دینے کے لئے آمادہ ہیں۔ بہرکیف وہ جس طرح بھی کہتے ہیں یہ تو صرف طرزِ فکر ہے اور طرزِ گفتگو ہے۔ لیکن عمل دنیا میں اور تفکر کی عملی منزل میں وہ اسی مقام پر ہیں جس مقام پر ایک آدمی غیب پر یقین کرنے والا اللہ تعالیٰ کی ذات کو پیش کرتا ہے اور ان تمام ایجنسیوں کو تسلیم کرتا ہے جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کیا ہے اور وہ ایجنسیاں جو شرطِ ایمان ہیں اور کسی ایسے شخص پر جو اللہ کو مانتا ہے اپنا تسلط رکھتی ہیں۔ اور ان تمام ایجنسیوں اور ان تمام ہستیوں کو وہ ایسی زندہ حقیقت اور ایسی ٹھوس معنویت تسلیم کرتا جیسے کہ مادہ پرست کسی پتھر کی یا معدنی یا کسی ایسے مظاہر کے متعلق چیز کو تسلیم کرتے ہیں جو ان کے سامنے بطور مشاہدے کے ہمہ وقت رہتی ہے۔ اور جس کو یہ چھوتے ہیں چکھتے ہیں، دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ جس کے متعلق وہ یہ کہتے ہیں کہ اس میں تغیر ہے، اس میں توازن ہے، اس میں ایک امتزاج ہے، اس میں تاثر ہے، اس میں قوت ہے اور جس قسم کی چیزیں وہ مادیت کی دنیا میں دیکھتے ہیں ان تمام چیزوں کا وہ اسی طرح تذکرہ کرتے ہیں اور ان پر ایک خاص طرز سے ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں ایک خدا کا پرستار جس طرح غیب پر ایمان رکھتا ہے بالکل اسی طرح مادے کا پرستار مادیت کی دنیا پر یقین رکھتا ہے۔ نہ خدا پرست کو غیب کی دنیا پر ایمان رکھے بغیر چارہ ہے اور نہ مادیت پرست کو مادے

پر ایمان لائے بغیر مفر ہے۔ دونوں ایک ہی طرز رکھتے ہیں۔ اور ان میں یہ چیز مشترک ہے کہ اس طرز پر ان کا ایمان اور ایقان ہوتا ہے۔ اسی ایمان و ایقان کو یہ زندگی کہتے ہیں۔ اصل میں کہنے کی بات یہ ہے کہ کوئی زندگی بغیر ایمان و ایقان کے ناممکن ہے خواہ کسی خدا پرست کی زندگی ہو یا مادہ پرست کی۔

●●●

رُوحانی آنکھ

اللہ تعالیٰ ایک وجود ہے، ایک ہستی ہے۔ جزو لاتجزیٰ وجود، ماورار ہستی۔ اس جزو لاتجزیٰ وجود اور ماورار ہستی کو خیال آیا کہ میں پہچانا جاؤں پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ جزو لاتجزیٰ وجود کے علاوہ اور بے شمار وجود موجود ہوں۔ جزو لاتجزیٰ وجود، ماورار ہستی نے اپنے ذہن میں موجود پروگرام کو جب وجود بخشا تو کہا "کن" اور موجودات ایک کنبے کی شکل میں تخلیق ہو گئیں۔

مشاہدے میں فتح کی آنکھ یہ دیکھتی ہے کہ اللہ کا یہ سارا کنبہ ایک نقطے میں بند ہے۔ جس طرح ٹھہرے ہوئے پانی میں جھانکنے سے پانی کے اندر اپنی شکل نظر آتی ہے، اسی طرح اس نقطے کے اندر دیکھنے سے یہ نظر آتا ہے کہ کائنات کے سارے افراد باہم دگر جڑے ہوئے، ملے ہوئے اور ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں۔ اس نقطے میں انسان بھی ہے، فرشتے اور جنات بھی ہیں۔ جمادات، نباتات اور حیوانات بھی ہیں۔ ان سب کی ہیئت کذائی اس طرح واقع ہے کہ ہر نوع کے ہر فرد میں ایک روشن نقطہ ہے اور اس روشن نقطے میں پوری کائنات منعکس ہے یعنی آدمی کے اندر بکری، بکری کے اندر نباتات و جمادات، نباتات و جمادات کے اندر فرشتے، جنات، ارض و سماوات سب یکجا طور پر موجود ہیں۔

فتح کے بعد شہود کی دوسری نظر سیر ہے۔ سیر کی آنکھ یہ دیکھتی ہے کہ یہ سارا یکجائی

پروگرام لوحِ محفوظ پر منقوش ہے اور لوحِ محفوظ کا منقوش پروگرام خالقِ کائنات کی تجلی سے بے شمار زمینوں (SCREENS) پر ڈسپلے (DISPLAY) ہو رہا ہے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار نوعیں اور انسانی شماریات سے ماوراء ان نوعوں کے افرادِ کائنات کے کل پرزے ہیں۔ یہ کائناتی مشین ایک دائرے (CIRCLE) میں چل رہی ہے۔ جزو لا تجزیٰ وجود سے اس کی حرکت شروع ہوتی ہے اور ماوراء ہستی کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ آپ چاہیں تو اس کی مثال دنیا کی کسی بھی مشین میں تلاش کر سکتے ہیں۔

اب آپ اپنے ہاتھ میں بندھی ہوئی گھڑی دیکھئے۔ یہ چند پرزوں سے مل کر وجود میں آنے والی ایک مشین ہے لیکن اس میں قدرت کے راز سربستہ ہیں۔ گھڑی کے اندر ایک بیورا، اسپرنگ اور گراری واضح نظر آ رہے ہیں۔ لیکن ان کے باہمی عمل اور اشتراک سے حرکت کا ایک نہ رُکنے والا سلسلہ جاری ہے۔ کوئی آگے پیچھے حرکت کر رہا ہے، کوئی دائرے میں گھوم رہا ہے، کوئی لحظہ بہ لحظہ اپنے حجم کو زیادہ کر رہا ہے۔ بیک وقت کئی حرکتوں پر گھڑی کی زندگی قائم ہے۔ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ الٹی سیدھی حرکت کیوں ہو رہی ہے۔ کچھ دیر کے لئے حرکت کے اس عمل پر غور کرنے سے آنکھ پس پردہ چھپے ہوئے راز کو دیکھ لیتی ہے۔ کل پرزوں کا بار بار ایک CYCLE میں چلنا اور پلٹنا ایک ہی حرکت ہے۔ گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ کی سوئیاں ڈائل پر موجود ہیں۔ سیکنڈ کی سوئی تیزی سے حرکت کر رہی ہے، اس تیزی سے کہ ہماری آنکھیں اس حرکت کو محسوس کر رہی ہیں۔ منٹ اور گھنٹے کی سوئیاں بھی حرکت میں ہیں لیکن ہماری نگاہوں کی کمزوری اس رفتار یا حرکت کو محسوس نہیں کرتی۔ ایک وقفے کے بعد جب ہم ان سوئیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو انکشاف ہوتا ہے کہ حرکت کا عمل جاری ہے۔ اس سسٹم میں اگر ایک پرزے کی کارگزاری بھی

متاثر ہو جائے یا کسی وجہ سے اس کی حرکت معطل ہو جائے تو حرکت کا سلسلہ رک جائے گا۔

قدرت کا کارخانہ بھی کل پرزوں سے مرکب ہے۔ آسمان، زمین، درخت، پہاڑ، چرندے، پرندے، حشرات الارض، فرشتے، جنات اور انسان سب اس عظیم الشان نظام کے اجزاء ہیں جن کے اشتراک سے حرکت کا منظم سلسلہ جاری و ساری ہے۔ فطرت کا اصول ہر نوع، ہر فرد، ہر ذرّہ کے لئے یکساں ہے۔ البتہ انسان کائنات کی مشین کا ایک ایسا پرزہ ہے جو اس مشین کے میکانزم سے واقف ہے۔ باقی مخلوق کل پرزے کی حیثیت میں حرکت کرنے پر مجبور ہے۔ میکانزم کے اس علم کو اللہ تعالیٰ نے امانت قرار دیا ہے۔

یہ مضمون قرآنِ پاک کی چار آیتوں اور ایک حدیثِ قدسی کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے:

۱۔ اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے "ہو" اور وہ ہو جاتی ہے۔ (قرآن)

۲۔ وہ اعلیٰ و ارفع ذات اللہ ہے جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا۔ (قرآن)

۳۔ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی طرف لوٹ جائے گی۔ (قرآن)

۴۔ ہم نے اپنی امانت سماوات اور زمین اور پہاڑوں کو پیش کی۔ سب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم اس امانت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم نے اس امانت کو اٹھایا تو ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے (ہمارا شعور بکھر جائے گا)۔ اور اس امانت کو انسان نے اٹھا لیا۔ (قرآن)

۵۔ میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ پس میں نے محبت کے ساتھ مخلوق کو تخلیق کیا تاکہ میں پہچانا جاؤں۔ (حدیثِ قدسی)

●●●

شعوری دبستان

زندگی کے ماہ و سال کا تجزیہ کرنے سے ہمیں نظر آتا ہے کہ زندگی اربوں کھربوں کل پرزوں سے بنی ہوئی ایک مشین ہے۔ جس طرح انسان کی بنائی ہوئی کوئی بھی چھوٹی بڑی مشین توانائی اور موبائل آئل کی محتاج ہے، اسی طرح انسانی پنجرے میں بند مشین بھی توانائیوں اور چکنائیوں کی محتاج ہے۔ جس طرح لکڑی، لوہے یا کسی دھات کی مشین فیڈنگ کے بغیر بے کار ہے، اسی طرح انسانی مشین کو فیڈ نہ کیا جائے تو اس کا ایک ایک عضو (PARTS) معطل اور بے کار ہو جاتا ہے۔

کیا خوب تماشا ہے!

آدمی کہتا ہے، میرا دل۔ آدمی کہتا ہے، میرا دماغ۔ آدمی کہتا ہے، میرے گردے
دل، دماغ، گردوں کو ایک نادیدہ توانائی بلا کسی توقف کے چلا رہی ہے اور ان بنیادی پرزوں کے ساتھ اربوں، کھربوں پرزے (CELLS) خود بخود متحرک ہیں۔ مگر آدم زاد کی کوتاہ نظری کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے اندر آواز کے ساتھ، جھٹکے کے ساتھ، تیز اور مدھم رفتار کے ساتھ چلنے والی مشین کو دیکھ نہیں سکتا، اس کی آواز سن نہیں سکتا۔ مشین کو چلانے والی توانائی کا غیر مرئی سلسلہ اگر منقطع ہو جائے تو اسے بحال نہیں کر سکتا۔

توانائی کا کام خود چل کر مشین کو مسلسل حرکت میں رکھنا ہے۔ توانائی کا صرف اگر اعتدال میں رہے تو زندگی بڑھ جاتی ہے۔ توانائی ضائع ہونے لگے تو زندگی کے چراغ

کی لو مدھم پڑ جاتی ہے اور پھر یہ چراغ ایک ہی دفعہ بھڑک کر بجھ جاتا ہے۔

آگ کے شعلے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک طرح کے شعلوں سے ہر چیز خاکستر ہو جاتی ہے اور دوسری طرح کے شعلوں سے ہر چیز کے اندر زندگی دوڑنے لگتی ہے۔ آدم زاد جب خیر کی روشنیوں سے اپنی آبیاری کرتا ہے تو یہ بھڑکتے ہوئے شعلے گل و گلزار بن جاتے ہیں اور آدم زاد جب شر کے خمیر سے اپنی آبیاری کرتا ہے تو یہ شعلے اسے جہنم کی آگ میں دھکیل دیتے ہیں۔

خیر و شر کیا ہے؟ طرزِ فکر کے دو نام ہیں۔ طرزِ فکر میں اگر بندگی اور اللہ کے ساتھ محبت ہے تو یہ خیر ہے۔ طرزِ فکر میں اگر غیر اللہ کی محبت ہے تو یہ شر ہے۔ خیر قائم بالذات (جل جلالہٗ) ہے اور شر قائم بالشیطان ہے۔ خیر کی تعریف یہ ہے کہ اللہ اسے پسند کرتا ہے اس کے برعکس شر یہ ہے کہ اللہ اسے پسند نہیں کرتا۔

آیئے، آج کی نشست میں کائنات کا نہیں، کائنات کے کل پرزے انسان کا مطالعہ کریں ۔۔۔!

شعور میں داخل ہونے سے پہلے کوئی انسان باپ کی شفقت اور ماں کی مامتا سے واقف نہیں ہوتا۔ شعوری دبستان میں قدم رکھتے ہی انسان کے اندر نیا جوش اور نئے ولولے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اندر تخلیقی صلاحیتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ تخلیقی صلاحیتیں اسے بالآخر ایسے نقطے پر لے آتی ہیں جس نقطے کا آغاز ہی نئی نئی تخلیقات سے ہوتا ہے۔ کوئی بندہ جب اس نقطے میں داخل ہوتا ہے تو اس کے اندر باپ کی شفقت اور ماں کی مامتا کے سوتے پھوٹنے لگتے ہیں۔ نتیجے میں وہ بالکل اپنی جیسی جیتی جاگتی تصویر بنا لیتا ہے۔ یہ تصویر بھی انسانی مشین کا ایک پرزہ ہے اور اس پرزے کی فیڈنگ

کے لئے ایک آٹومیٹک نظام جاری و ساری ہے۔ آدم زاد اس تصویر کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لئے وسائل کی تلاش کرتا ہے اور وسائل کی تلاش میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس سے خود آگاہی منحرف ہو جاتی ہے۔

تصویر کو اللہ تعالےٰ نے اولاد اور وسائل کو اموال کہا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے فرمان کے مطابق مال اور اولاد انسان کے لئے فتنے ہیں کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ تعالےٰ مال اور اولاد کو فتنہ کہتا ہے اور بندہ اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ، اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ اور اپنی پوری دانائی کے ساتھ اس فتنے سے قریب ہو رہا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے مال اور اولاد کو فتنہ کیوں کہا ہے ؟

یاد رکھئے! ہر وہ چیز جو عارضی ہے حقیقت نہیں ہوتی اور جو چیز حقیقی نہیں ہے وہ حق سے قربت حاصل نہیں کر سکتی۔ مال ہو یا اولاد یہ سب عارضی اور غیر حقیقی تصویریں ہیں۔ بندہ جب ان عارضی اور غیر حقیقی تصویروں کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا ہے تو یہ سب اس کے لئے مصیبت اور فتنہ بن جاتی ہیں۔

●●●

مائی صاحبہ

سرو قد، لالہ رخسار، غزال چشم، غنچہ دہن، کتابی چہرہ، صراحی دار گردن، بال ایسے جیسے چاندی کے تار، معطر معطر، خراماں خراماں ایک مائی صاحبہ تشریف لائیں۔ کمرے میں قدم رکھا تو جھکا کا ہوا اور آنکھوں کے سامنے قوس قزح کے رنگ بکھر گئے۔ مائی صاحبہ نے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولیں: "بیٹا! تجھے دیکھنے کی تمنا تھی سو پوری ہو گئی۔"

حیرت زدہ آنکھوں اور کھوئے کھوئے دماغ سے میں نے پوچھا: "آپ کا نام کیا ہے، کون ہیں آپ اور کہاں سے آئی ہیں؟"

ملکوتی تبسم کے ساتھ گویا ہوئیں: "میرے دو نام ہیں۔ ایک نام مفروضہ اور فکشن ہے اور دوسرا نام مفروضہ اور فکشن جو اس کے برعکس ہے۔"

میں نے نام کی تعریف ایسی کبھی سنی نہ تھی۔ حیرت و استعجاب سے پوچھا: "کیا نام بھی غیر حقیقی ہوتے ہیں؟ نام تو پہچان کا ایک ذریعہ ہے۔"

کچھ عجیب انداز سے خلا میں گھورتے ہوئے بولیں: "تمہارا نام کب رکھا گیا تھا؟"

میں نے مؤدبانہ لہجے میں عرض کیا: "جب میں پیدا ہوا تھا۔"

ہنستے ہوئے کہا: "کیا تم وہی ہو جو پیدا ہوئے تھے؟ کیا تمہارا ایک ایک عضو بدل نہیں گیا؟ کیا تم پنگوڑے سے باہر آ کر زمین پر دندناتے نہیں پھرتے ہو، جب تم پیدا ہوئے

تو تمہارے ہاتھ اتنے ہی بڑے تھے جتنے اب ہیں اور اپنے قد کاٹھ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ؟"

خفت اور ندامت کے ساتھ میں خاموش ہو گیا۔ تجسس نے مجبور کیا تو پھر پوچھا۔

"آپ کون ہیں ؟"

بولیں: "میرے دو وجود ہیں۔ ایک وجود پر ہر لمحہ، ہر آن موت وارد ہوتی رہتی ہے۔ جس لمحہ موت وارد ہوتی ہے اس ہی لمحہ ایک نیا وجود تشکیل پا جاتا ہے۔ میرا یہ وجود لمحہ بہ لمحہ موت اور لمحہ بہ لمحہ حیات ہے۔ میرا دوسرا وجود وہ ہے جس پر لمحات، گھنٹے، دن اور ماہ و سال اثر انداز ہی نہیں ہوتے۔ نہ تو وہ پیدا ہوتا ہے اور نہ مرتا ہے۔"

مائی صاحبہ کی زبانی یہ اسرار و رموز کی باتیں سُن کر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ کوئی بہت بڑی عالم فاضل عورت ہیں۔ یا مظہر العجائب! میرے دماغ میں جیسے ہی یہ خیال وارد ہوا، مائی صاحبہ بولیں: "نہیں بیٹا نہیں۔ میں عالم فاضل نہیں ہوں۔ مجھے تو خط بھی لکھنا نہیں آتا۔ میں خواجہ غریب نوازؒ کی داسی ہوں۔"

"آپ خواجہ غریب نوازؒ کی داسی ہیں! آپ کا قیام کہاں ہے ؟"

"بیٹا! قیام مقام سے ہوتا ہے۔ میرے دو مقام ہیں۔ ایک مقام ٹائم اسپیس میں بند ہے۔ میں اس مقام میں خود کو پابند اور مقید محسوس کرتی ہوں۔ چند میل بھی اگر سفر کرنا پڑے تو وسائل کی محتاجی ہے۔ میرا دوسرا مقام وہ ہے جہاں میں وسائل کی محتاج نہیں ہوں، وسائل میرے پابند ہیں۔"

قیام اور مقام کی یہ فکر انگیز گفتگو سُن کر میری کیفیت کچھ ایسی ہو گئی جیسے کسی ساٹھ سالہ کسان کے سامنے آئن سٹائن کا فارمولا بیان کیا جا رہا ہو۔

مائی صاحبہ نے جب دیکھا کہ بچہ نروس ہو گیا ہے تو دو قدم آگے بڑھیں اور میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ ابھی ان کا شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر ہی تھا کہ بچوں نے شور مچا دیا۔ "دادی آ گئیں، دادی آ گئیں!" دادی نے بھی اپنے معصوم پوتوں اور پوتیوں کو کلیجے سے لگایا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

بڑی بیٹی نے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا: "دادی! کچھ اپنی زندگی کے بارے میں بتائیں۔" مائی صاحبہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئیں۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور انہوں نے اپنی آپ بیتی اس طرح بیان کی۔

"میرا نام جیوتی تھا۔ عمر ہو گی کوئی چودہ سال۔ ماں باپ نے پھیرے کرا دیئے۔ ابھی دلہن کے خواب پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ پتی روٹھ گیا۔ سسرال والوں نے مجھے ستی کرنے کے مشورے شروع کر دیئے۔ میرے کانوں میں بھنک پڑ گئی۔ میں گھپ اندھیری رات میں سسرال کے گھر سے میکے پہنچی۔ ماتا جی نے مجھے سینے سے لگایا لیکن میرا باپ مذہبی آدمی تھا۔ اس نے اس طرح گھر آنا پسند نہیں کیا۔ جب تین پہر رات ڈھل گئی تو ماں نے گھر کے پچھلے دروازے سے مجھے باہر کر دیا۔ میں دوڑتی رہی، دوڑتی رہی یہاں تک کہ اُفق سے سُورج نمودار ہوا۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں دن بھر پڑی روتی سسکتی رہی اور اپنے مقدر کو کوستی رہی۔ سورج نے جیسے ہی رات کے پردے میں اپنا چہرہ چھپایا، میں منزل کا تعین کئے بغیر پھر دوڑنے لگی۔ لہولہان پیروں، نحیف و نزار جسم اور خشک حلق کے ساتھ نہ معلوم کس طرح خواجہ غریب نوازؒ کے دربار میں جا پہنچی۔ ڈر اور خوف کا غلبہ اتنا تھا کہ مزار کے اندر جا کر میں نے اندر سے کنڈی لگا لی اور خواجہ صاحبؒ کی لحد سے لپٹ کر لیٹ گئی۔ ایسا سکون ملا کہ لگتا تھا میں دو تین سال کی بچی ہوں اور خواجہ غریب نوازؒ کی قربان کی گود

ہے۔ اِدھر میں سرور کی کیفیت میں سرشار تھی، اُدھر باہر کہرام مچ گیا کہ کوئی دیوانی اندر گھس گئی ہے۔ لوگ چیختے رہے، چلاتے رہے، دروازہ پیٹتے رہے مگر میں سکون کی وادی میں تھی۔ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بالآخر قرار آیا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ اور پھر وہاں جھاڑو دینے کی خدمت پر مامور کر دی گئی۔ پاکستان بنا تو میں اپنی ہی جیسی ایک عورت پر عاشق ہو گئی اور اس خاتون کے ساتھ پاکستان آ گئی۔"

چھوٹی بیٹی نے پوچھا: "دادی اماں! ہمارے گھر کا پتہ آپ کو کس نے بتایا؟"

مائی صاحبہ نے بہت زور کا قہقہہ لگایا اور فرمایا: "بیٹی! جس بندہ کو اپنے اصلی مالک کا پتہ مل جاتا ہے اس کے لئے کوئی پتہ، کوئی ٹھکانا، کوئی مقام ڈھونڈنا مشکل نہیں ہوتا۔"

سبحان اللہ! کیسا سعید دن تھا کہ سارے دن انوار کی بارش برستی رہی۔ در و دیوار میں سے رنگ رنگ روشنیاں پھوٹتی رہیں۔ ایسا سماں تھا جس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا۔ رات کو رخصت ہوتے وقت میں نے مائی صاحبہ کی قدم بوسی کی، ان کے نرم اور جھاگ سے ملائم خوبصورت ہاتھوں کو چوما، آنکھوں سے چھوا اور بے قرار دل کے ساتھ کہا: "مائی صاحبہ! کوئی نصیحت کریں۔"

مائی صاحبہ ایک دم آسمان کی طرف دیکھنے لگیں، اس طرح کہ پلکوں کا ارتعاش رُک گیا، ڈھیلوں کی حرکت ساکت ہو گئی۔ لگتا تھا ذہن اور دماغ دونوں کسی نادیدہ نقطہ پر مرکوز ہیں۔ ہم سب بے خود اماں کے استغراق اور تجلی سے معمور چہرے کو تکتے رہے۔ ایک بلند آواز گونجی: "بیٹیا۔۔۔!"

انگشتِ شہادت کھلی، ہاتھ آسمان کی طرف بلند ہوا اور زبان سے یہ الفاظ نکلے۔۔۔

"بیٹیا۔۔۔! رب راضی سب راضی۔"

●●●

جاودانی زندگی

عالمِ خیال سے اُس پار عالمِ برزخ سے رُوح گزر کر جب بچے کے رُوپ میں اپنا مظاہرہ کرتی ہے تو اس بچے کی پہلی استاد وہ ہے جو بچے کو نہلا دھلا کر سفید جھاگ جیسے کپڑے میں ملفوف کرتی ہے۔ اس کے بعد استاد کے فرائض ماں سنبھال لیتی ہے۔ ماں کی ممتا بچے کو سب سے پہلے صفائی کا تصور دیتی ہے۔ صفائی کے ایک لامتناہی عمل کے ساتھ ساتھ ماں بچے کی شعوری سطح پر باپ کا تصور اُبھارتی ہے۔ یہ تصور گہرا ہوتا ہے تو بچے کے ننھے سے دماغ کے ننھے ننھے خلیوں میں دادا، دادی اور نانا، نانی کی تصویریں منعکس ہونے لگتی ہیں۔۔۔ اور پھر ماں کے ساتھ باپ اور خاندان کے قریبی افراد مل جُل کر بچے کے استاد کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ جس قسم کے اُستاد ہوتے ہیں وہی بچے کی طرزِ فکر بن جاتی ہے۔ طرزِ فکر کی گہرائی بچے کی شخصیت کا تعین کرتی ہے۔ افرادِ خاندان کبر و نخوت، احساسِ برتری کے کردار ہوتے ہیں تو بچہ بھی ان کرداروں کا اثر قبول کرتا ہے۔ خاندان کے بڑے چھوٹے اخلاص، محبت اور ایثار کے پیکر ہوتے ہیں تو بچے کے اندر میکانکی طور پر خلوص، محبت، اخوت، حلم اور بردباری کے جذبات اُبھرتے رہتے ہیں۔ طرزِ فکر کی بھٹی میں آدمی جل کر راکھ بن جاتا ہے اور طرزِ فکر کی بھٹی میں آدمی کُندن بھی بن جاتا ہے۔

میرا بچپن ۔۔۔۔ پوری ایک داستان ہے۔ فکشن داستان نہیں، حقیقی کرداروں کے

ساتھ داستان ——— پیدا ہوا تو ایک نہایت بلند شخصیت نے کھجور چبا کر منہ میں ڈالی۔ بڑا ہوا، مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ قرآن پڑھانے والے اُستاد حسن جمال سے بے بہرہ تو تھے ہی حُسنِ اخلاق بھی یہ تھا کہ کھال اور ہڈی ماں باپ کی، باقی سب کچھ حافظ جی کا۔ پٹتے گئے، مضروب ہڈیوں کے ساتھ قرآن پاک کے نورانی الفاظ جن میں معنی و مفہوم نہیں تھا دماغ کی سلیٹ پر نقش ہو گئے۔ پھر ایسا ماحول ملا جہاں ہر طرف دین کا چرچا تھا۔ لباس پر، وضع قطع پر بھی ایک مخصوص لبادہ تھا۔ گھر کا عالم یہ تھا کہ ماں بے چاری سہمی ہوئی، ڈری ہوئی ایک ہستی تھی۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایک مشین تھی جو نہ معلوم کس ایندھن کے زور پر چل رہی تھی۔ یہ مشین کبھی پتھر کے دو پاٹوں پر آٹا پیستی تھی، کبھی اوکھلی میں دھان ڈال کر ان کے اوپر موسل برساتی تھی۔ یہ مشین گھر میں اس طرح چلتی پھرتی تھی گویا اس کا کام ہی ہر وقت چلنا ہے۔ اور کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ہے۔ ماں کی مہربانی سے نوالہ تو سونے کا ملتا تھا مگر دیکھا شیر کی نظر سے جاتا تھا ——— شیر کی نظر کیا ہوتی ہے؟ شیر جب اپنی خونیں آنکھوں سے دیکھتا ہے تو آدمی کا سب کھایا پیا ختم ہو جاتا ہے اور برسوں کی جمع شدہ کیلوریز (
) آنِ واحد میں راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔

ستر سال، اسی سال، نوے سال کے بوڑھوں کے اندر یقین کا عالم یہ تھا کہ ان سے جب کہا جاتا کہ تم جنتی ہو تو انہیں کرنٹ سا لگ جاتا اور وہ التجا آمیز نظروں اور منت پذیر لہجے سے کہتے کہ خدا کرے تمہارا کہا سچ ہو۔ انہیں اپنی عبادتوں اور ریاضتوں پر اتنا بھی یقین نہیں تھا جتنا عام آدمی کو عام آدمی پر ہوتا ہے۔

بے یقینی کے اس ماحول میں پرورش پا کر میں شعور کی اس منزل پر پہنچا جہاں آدمی اپنے لئے کچھ فیصلے کرتا ہے۔ اس کی سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ ماضی ہی سب کچھ نہیں، مستقبل بھی

ایک ضرورت ہے۔ بے یقینی کے اس دَور سے نکل کر یقین کے راستوں کی تلاش ہوئی۔ ذہن میں خیال وارد ہوا کہ یقین وہاں ملے گا جہاں خوف نہیں ہوگا۔ یقین کی دولت وہاں سے ملے گی جہاں غم نہیں ہوگا ——— قصہ مختصر، خوف اور غم سے نجات یافتہ گروہ کی تلاش میں برسوں بیت گئے۔ پرکھ کا ایک ہی زاویہ سامنے تھا کہ اللہ کے دوستوں کو خوف اور غم نہیں ہوتا۔ سترہ سال کی عمر سے چھبیس سال تک اللہ کے ایسے دوست کی تلاش میں سرگرداں رہا جس کو اللہ کے ارشاد کے مطابق غم اور خوف نہ ہو۔ کرامات دیکھیں، کشفِ جمال اور کشفِ قبر کے قصے سنے۔ ایسے حضرات سے وابستگی ہوئی کہ ان کے ایک اشارے سے روحیں آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ ایسے قدسی نفس لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کے ایک ایک لمحے پر شریعتِ مطہرہ کی چھاپ تھی۔ مگر ایسے بندے تک رسائی نہیں ہوئی جس کے اندر خوف اور غم نہ ہو۔ جب دل گداز سے معمور ہو گیا، آنکھیں آنسوؤں سے لبریز رہنے لگیں، دماغ یکسوئی کی طرف مائل ہوتا چلا گیا تو اللہ کا وعدہ پورا ہوا۔

"اور وہ لوگ جو اللہ کے لئے جہد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنے راستوں کی ہدایت بخشتا ہے۔"

خوشا نصیب! ایک مردِ آزاد ملا، ایسا آزاد بندہ کہ اس کے اوپر غم اور خوف کے بادل کبھی سایہ نہیں کرتے۔ وہ لوگ جو غمگین اور خوف زدہ رہتے ہیں جب ایسے بندے کی مجلس میں جا بیٹھتے ہیں تو ان کے اوپر سکون و راحت، مسرت اور خوشی کی بارش برسنے لگتی ہے۔

یہ آزاد مرد ———

قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ ہیں، قدرت نے جن کو پیار و محبت سے اپنی آغوش

یں سمیٹ لیا ہے۔ اس آزاد مرد نے طرزِ فکر کی بھٹی میں ڈال کر وہ تمام بُت پاش پاش کر دیئے جو ماحول سے ورثہ میں ملے تھے ـــــ بے یقینی کا بُت، بھوک افلاس سے خوف کا بُت، موت کے ڈر کا بُت، عزت و بے عزتی کا بُت ـــــ اندر (INNER) میں بسنے والی طلسماتی دنیا زیر و زبر کر دی گئی اور یقین کا ایک ایسا پیٹرن بنا دیا گیا جہاں نظر اللہ کے سوا کچھ نہیں دیکھتی، دل اللہ کے سوا کسی اور کو محسوس نہیں کرتا، جہاں علمِ بے عمل جہالت ہے اور جہاں بے یقینی شرک ہے اور یقین جاودانی زندگی ہے۔

●●●

ماضی اور مستقبل

جب ہم زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک ہی حقیقت آتی ہے کہ آدم کا ہر بیٹا اور حوا کی ہر بیٹی خوش رہ کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں لیکن زندگی کا مادی نظریہ ہر قدم پر انہیں مایوس کرتا ہے۔ اس لئے کہ ہماری زندگی کا ہر ہر لمحہ فانی اور متغیر ہے۔ مادی اعتبار سے ہمیں یہ بھی علم نہیں ہے کہ سچی خوشی کیا ہوتی ہے اور کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ حقیقی مسرت سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی اصل بنیاد (BASE) کو تلاش کریں۔

جب ہم کچھ نہیں تھے تو کچھ نہ کچھ ضرور تھے، اس لئے کہ کچھ نہ ہونا ہمارے وجود کی نفی کرتا ہے۔ ہماری مادی زندگی ماں کے پیٹ سے شروع ہوتی ہے اور یہ مادہ جب ایک خاص پروسس (PROCESS) سے گزر کر اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو ایک جیتی جاگتی تصویر عدم سے وجود میں آجاتی ہے۔ ماحول سے اس تصویر کو ایسی تربیت ملتی ہے کہ اسے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ سچی خوشی حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے اور کس طرح یہ سچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

حقیقی مسرت سے ہم آغوش ہونے کے لئے انسان کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہئے کہ زندگی کا دار و مدار صرف جسم پر ہی نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر ہے جس حقیقت نے خود اپنے لئے جسم کو لباس بنا لیا ہے۔ پیدائش کے بعد زندگی کا دوسرا

مرحلہ ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ ہمارا ہر ہر لمحہ مرتا رہتا ہے اور ہر لمحے کی موت دوسرے لمحے کی پیدائش کا ذریعہ بن رہی ہے۔ یہی لمحہ کبھی بچپن، کبھی لڑکپن، کبھی جوانی اور کبھی بڑھاپے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ہم اس حقیقت تک رسائی اس طرح حاصل کر سکتے ہیں کہ ہم یہ جان لیں کہ جیتی جاگتی تصویر ایک جسم نہیں ہے بلکہ ایک شعور ہے۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم اسے بالکل شعور بھی نہیں کہہ سکتے کیوں کہ شعور ہماری پہچان کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے اوپر ساری عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جسم کے ختم ہوتے پر مادّی کثافت اور آلودگی ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ بات بھی ہمارے سامنے ہے کہ جسم کے ختم ہونے کے بعد شعور فنا نہیں ہوتا بلکہ شعور کسی دوسرے عالم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ جتنی آسمانی کتابیں ہیں ان سب میں ایک ہی بات کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی صرف مادّی جسم نہیں ہے بلکہ ایک شعور ہے۔ ہم جب پیدائش سے موت تک کی زندگی کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ جان لیتے ہیں کہ جس شعور کی بنیاد ماں کے پیٹ میں پڑی تھی وہ شعور ایک طرف گھٹتا رہتا ہے اور دوسری طرف بڑھتا رہتا ہے۔ جیسے جیسے شعور گھٹتا ہے آدمی ماضی میں جاتا رہتا ہے اور جیسے جیسے شعور بڑھتا ہے آدمی مستقبل میں قدم رکھتا ہے۔ شعور کا گھٹنا بڑھنا عمر کا تعین کرتا ہے۔ شعور کے ایک زمانے کو "بچپن" کہتے ہیں، شعور کے دوسرے زمانے کو "جوانی" اور شعور کے تیسرے زمانے کو "بڑھاپا"۔ بالآخر جو شعور اس مادّی زندگی کو قائم رکھے ہوئے ہے اور جس شعور پر یہ جسم ارتقائی منازل طے کر رہا ہے وہ قائم رہتا ہے۔

ہم جب اپنے آپ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک محدود

اور فنا ہونے والا جسم ہے اور یہی ہماری زندگی کی پہچان ہے۔ یہ جسم جو ہمیں نظر آتا ہے اس کے اجزائے ترکیبی کثافت، گندگی، تعفن اور سڑاند ہیں۔ اس سڑاند کی بنیاد اس نظریہ پر قائم ہے کہ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں مادہ ہوں اور میں اس مادّی دنیا کی پیدائش ہوں۔ یہ محدود نظریہ ہر آدمی کو کسی مقام میں محدود کر دیتا ہے اور ہر آدمی ایک محدودیت کے تانے بانے میں خود کو گرفتار کر لیتا ہے اور اس طرح محدود اور پابند نظریے کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ زمین پر بسنے والا ہر آدمی جب اپنا تذکرہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، میں ہندو ہوں، میں پارسی ہوں، میں عیسائی ہوں حالانکہ روح کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ روشنی ہر جگہ روشنی ہے چاہے وہ عرب میں ہو، عجم میں ہو یا یورپ میں ہو یا ایشیا کے کسی حصے میں۔

اللہ کا نظام کچھ اس طرح قائم ہے کہ اس دنیا میں جو اللہ کا پیغام آیا وہ اپنے الفاظ کے ساتھ قائم ہے۔ عیسائیوں کے لئے بائبل کے الفاظ مذہب کا درجہ رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے قرآن مذہب کا پیش رو ہے۔ ہندو بھگوت گیتا کے الفاظ کی عبادت کرتے ہیں۔

سب آسمانی کتابیں دراصل خدا کے برگزیدہ بندوں کی وہ آوازیں ہیں جو روشنی بن کر تمام عالم میں پھیل گئی ہیں۔

●●●

خاکی پنجرہ

یہ کون نہیں جانتا کہ زندگی ماضی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ دانشور اور مفکرین زمانہ کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ ماضی گزرا ہوا زمانہ، حال موجودہ زمانہ اور مستقبل آنے والا زمانہ ــــ لیکن جب ایک باشعور آدمی زندگی کا تجزیہ کرتا ہے تو اُسے ماضی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ تجزیہ طبعی تقاضوں کا ہو، نفسیاتی پہلو سے ہو یا روحانی نقطۂ نظر سے ہو۔ ہم جب بچے کی پیدائش کا تذکرہ کرتے ہیں تو دراصل یہ کہتے ہیں کہ بچہ کہیں موجود تھا، وہاں سے اس دنیا میں منتقل ہوا۔ خوبصورت، تنومند اور رعنائیوں سے بھرپور، کسی نوجوان کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس کا مفہوم بھی یہی ہوتا ہے کہ کل کا بچہ آج جوانی کے روپ میں موجود ہے۔ ہم جب عقل و شعور اور تجربہ کی بات کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس بزرگ کا تجربہ ساٹھ سال کے ماہ و سال پر پھیلا ہوا ہے تب بھی ہمارا منشا یہی ہوتا ہے کہ اس بوڑھے کے ساٹھ سال ماضی میں دفن ہیں۔ نوعِ انسانی جب اپنے اسلاف کے ورثہ کا تذکرہ کرتی ہے تو بھی یہی کہا جاتا ہے کہ انسانی شعور نے بتدریج ترقی کی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ پتھر کی تہذیب میں خود ساختہ قید و بند کی زندگی گزار رہا تھا۔ پھر وہ وقت آیا کہ آدم زاد نے کسی طرح آگ کا استعمال سیکھ لیا۔ ایک جست اور لگائی تو لوہے کے زمانے میں داخل ہوگیا۔ لوہے کی اور مختلف دھاتوں کی تہذیب نوعِ انسانی کا ورثہ قرار پائی۔ علم و شعور کی وادی میں قدم رکھنے کے بعد انسان کے اندر تفکر کا

پیٹرن (PATTERN) بنا۔ اس کا نام جدید تہذیب یا سائنسی ترقی رکھا گیا۔ ایک کھرب سال کی پُرانی تاریخ ہو یا آج کے سائنسی علوم، ان سب کی بنیاد دستاویز (RECORD) پر ہے اور یہ سارا ریکارڈ ماضی ہے۔ ماضی کیا ہے، زمانہ ہے۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد عالی مقام ہے کہ زمانہ کو نظر انداز نہ کرو۔ زمانہ اللہ ہے۔ انسان جس کو حال اور مستقبل کہتا ہے وہ دراصل زندگی گزارنے کا ایک مسلسل اور متواتر عمل ہے۔ زندگی کے اس عمل میں دو طرزیں متعین کی گئی ہیں۔ انسان زندگی کی ایک طرز کا نام سکون رکھتا ہے اور زندگی کی دوسری طرز کو بے سکونی، درماندگی، پریشاں حالی، اضطراب، خوف اور بے چینی کا نام دیتا ہے۔ لیکن جب ہم نفسیاتی طور پر ان دونوں طرزوں کا تفکرانہ انداز میں مطالعہ کرتے ہیں تو صرف اور صرف ایک ہی بات مشاہدہ میں آتی ہے کہ ان دونوں طرزوں کا تعلق بھی براہِ راست ماضی سے ہے۔ آج کی پریشانی اگر ماضی نہ بن جائے تو انسان اس پریشانی کے ہاتھوں مخبوط الحواس ہو جائے گا، اس کے اوپر پاگل پن کے دورے پڑنے لگیں گے۔ آدم اور حوّا کی نسل میں اگر ایک ہی کیفیت مستقل ہو جائے تو زندگی منجمد ہو جائے گی، اس لئے کہ کائنات کی تخلیق اس فارمولے پر عمل میں آئی ہے کہ زندگی ایک حرکتِ دوام ہے۔ بہ الفاظِ دیگر حرکت ہی زندگی کا نام ہے۔ حرکت رُک جائے گی تو کائنات ختم ہو جائے گی۔ رات دن کے مشاہدات زندگی کی ان طرزوں کو ہمارے اوپر آشکار کرتے ہیں۔ گرمی کے ساتھ سردی، سردی کے ساتھ گرمی، صحت کے ساتھ بیماری، بیماری کے بعد صحت، پیدائش اور موت کا سلسلہ بھی اسی فارمولے (EQUATION) پر قائم ہے۔

ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی مر گیا تو دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ فلاں آدمی کا

کردار، فلاں آدمی کی زندگی یا فلاں آدمی کی آواز ایک دستاویزی ریکارڈ بن گئی مطلب یہ ہے کہ جو آدمی مرگیا وہ ماضی میں چلا گیا۔ جب ہم اپنے اسلاف کا تذکرہ کرتے ہیں (اسلاف میں آدم سے لے کر اپنے آبا و اجداد تک سب شامل ہیں)، تو در اصل ماضی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جس طرح آج ہم اپنے آبا و اجداد کو ماضی کہہ رہے ہیں، کل اسی طرح ہماری نسل ہمارا تذکرہ بھی ماضی کے نام سے کرے گی۔

ماضی ہماری ابتدا ہے اور ماضی ہی ہماری زندگی کا پورا ریکارڈ ہے۔

کسی سو سالہ بوڑھے بزرگ کے دماغ میں سے اگر اس کا بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ماضی کو حذف کر دیا جائے تو یہ بوڑھا بزرگ کیا رہے گا۔ اے عقل والو ذرا غور کرو۔۔۔

جس طرح سو سالہ زندگی ریکارڈ اور ماضی ہے اسی طرح جب اس خاکی پنجرے پر موت واقع ہوتی ہے تو خاکی جسم کی ساری زندگی ماضی بن جاتی ہے۔ فلسفیانہ طرز دوں سے ہٹ کر جب ہم حقیقت یعنی روحانی علوم میں تفکر کرتے ہیں تو ہمارے اندر میں ایک دروازہ کھلتا ہے۔ اس دروازے میں سے قرآن پاک کے انوار لہروں کی شکل میں ہمارے دماغ پر نازل ہوتے ہیں اور یہ لہریں قرآن پاک کے الفاظ میں ہمیں یہ پیغام سناتی ہیں۔

"اور آپ کیا سمجھے اعلیٰ زندگی کیا ہے اور آپ کیا سمجھے اسفل زندگی کیا ہے۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔"

علمِ حقیقت ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اگر ہم خود سے اور اپنے خالق سے متعارف ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم اپنے ماضی میں جھانکیں۔ ماں کے پیٹ میں آنے سے پہلے بچہ عالمِ برزخ میں تھا۔ عالمِ برزخ، لوحِ محفوظ کا ایک عکس ہے۔ لوحِ محفوظ کتاب المبین کا ایک ورق ہے۔ کتاب المبین عالمِ ارواح ہے اور عالمِ ارواح

وہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب "کُن" کہا تھا تو اس کا ظہور ہوگیا تھا۔ مرنے کے بعد کی زندگی در اصل اسی عالمِ ارواح کی طرف پیش قدمی ہے۔ نوعِ انسانی کے جو افراد اس زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ان کو ایسی نظر اور بصیرت مل جاتی ہے جو اس عالم کو دیکھ لیتی ہے، سمجھ لیتی ہے۔

●●●

اسٹیم

مطالعۂ کائنات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن میں وضو، نماز، صوم و زکوٰۃ، حج، طلاق، قرض وغیرہ پر ڈیڑھ سو آیات ہیں۔ تسخیری فارمولوں اور مطالعۂ کائنات کے متعلق سات سو چھپن آیتیں ہیں۔ قرآن پاک ہمیں زمین کے اندر معدنیات اور پہاڑوں کے اندر خزانوں سے مستفید ہونے کا درس دیتا ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔ لیکن مسلمان نے جب سے اس کتاب کو محض حصولِ مقصد کا واسطہ اور آفات و بلیات سے نجات کا ذریعہ سمجھ لیا ہے اس کتاب کے اندر تسخیری فارمولوں اور کائناتی اسرار و رموز سے محروم ہو گیا ہے۔ قرآن پاک کا دعویٰ ہے کہ دین مکمل کر دیا گیا ہے یعنی نوعِ انسانی کی معاشرتی، علمی، اخلاقی اور روحانی ترقیوں کے اصول و قواعد کھول کھول کر قرآن حکیم میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ قرآن پاک نوعِ انسانی کا ورثہ ہے۔ نوعِ انسانی میں جو قوم اس ورثہ سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے، قرآن اس کی رہنمائی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "ہم نے لوہا نازل کیا اور اس میں نوعِ انسانی کے لئے بے شمار فائدے محفوظ کر دیئے ہیں۔"

جس قوم نے قرآنی اعلان پر تفکر کر کے کوشش اور جدوجہد شروع کی وہ کامیاب ہوتی رہی اور آج بھی کامیاب ہے۔ اہلِ یورپ لوہے، تانبے اور زمین کے اندر خزانوں

کی تلاش میں جب سرگرداں ہوئے تو قانونِ قدرت کے مطابق ان کے اوپر زمین کے خزانوں نے خود اپنی افادیت ظاہر کرنا شروع کر دی۔ اور انہوں نے لوہے، تانبے اور دیگر دھاتوں کے مرکب سے ایسی ایجادات میں کامیابی حاصل کر لی کہ وہ اقوامِ عالم میں ممتاز ہو گئے۔ ہواؤں میں اڑنا زندگی کا معمول بن گیا۔ سمندروں اور دریا کی سطح پر تیرنا اور ہزاروں لاکھوں ٹن سامان اِدھر سے اُدھر پہنچانا ایک عام بات بن گئی۔ ان کی ذہنی کاوشوں سے زمین کے فاصلے سمٹ گئے۔ دنیا کی خبریں اِس کونے سے اُس کونے تک پہنچنے لگیں۔ اسٹیم اور بھاپ کی دریافت سے ریل گاڑیوں کا نظام قائم ہوا۔ زمین کے اندر سے گیس اور پٹرول نکلا تو موٹر کاریں زمین پر دوڑنے لگیں۔ لاسلکی نظام کے تحت دور دراز رہنے والوں، رشتہ داروں، پیارے دوست ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ انہوں نے باد و باراں کے نظام سے باخبر ہو کر ایسے انکشافات کئے کہ جن سے اللہ کی مخلوق حوادثِ سماوی سے محفوظ رہ سکے۔

یہ سب اس لئے ہوا کہ ان مفکرین اور دانشوروں نے صحیفۂ کائنات کے مطالعہ کے بعد اس کے قوانین اور آیات کو اپنی اور نوعِ انسانی کی بہتری کے لئے استعمال کیا۔

قرآن بہ آوازِ بلند فرماتا ہے ـــ "قرآن تسخیری فارمولوں کی کتاب ہے۔ اقوامِ عالم میں ممتاز ہونے کے لئے اس میں غور کرو، تفکر کرو، اس کو جانو، اس کو پہچانو۔ آخر تم لوگ اللہ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ـــ"

اللہ تعالیٰ کی عظمت، بزرگی اور صناعی کو سمجھنے کے لئے اس کی تخلیق اور نظامِ ربوبیت میں غور اور تدبر کرو۔

ایجادات و ترقی اور علم و ہنر کا جو سورج آج مغرب میں روشن ہے، کبھی

مشرق میں چمکتا تھا اور جب مشرقی اقوام بالعموم اور مسلمانوں نے بالخصوص علم و ہنر کے اس سورج سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تو علم و ہنر نے بھی مسلمانوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"جو قومیں اپنی تقدیر بدلنے کی کوشش نہیں کرتیں، اللہ بھی ان میں تغیر پیدا نہیں کرتا۔"

اللہ کے پھیلائے ہوئے نظام پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں دو دنیائیں ہیں۔ اور ان دنیاؤں میں جو مخلوق آباد ہے اس مخلوق کے ہر فرد میں چار آنکھیں ہیں، دو دماغ ہیں، دو ناک ہیں، چار کان ہیں، چار ہاتھ ہیں، چار پیر ہیں مخلوق کا ہر فرد چھ سمتوں میں قید ہے۔ ہر فرد کے دو رُخ ہیں۔ ایک ٹھوس، دوسرا لطیف۔ زندگی گزارنے کے لئے مکان (SPACE) ایک ہے اور زمان (TIME) کا کوئی حد و شمار نہیں ہے۔ مکان فرد کو اس کے ہونے کا احساس دلاتا ہے اور زمان (TIME) یہ بتاتا ہے کہ انسان ساٹھ ہزار حواس سے مرکب ہے اور جب کوئی قوم اپنے ان حواس سے باخبر ہونے کی جد و جہد کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اوپر ترقی و تعمیر کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس کے ذہن پر ترقی و ایجادات کے روشن پہلو اور سائنسی علوم نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اور پھر یہ قوم خلاؤں میں اور زمین پر تصرف کر کے اقوام عالم کے سر کا تاج بن جاتی ہے اور جو قوم تلاش و جستجو، فکر و دانش اور غور و تدبر سے عاری ہوتی ہے وہ زمین پر غلام بن کر اور ذلیل و خوار ہو کر زندگی بسر کرتی ہے۔

●●●

ایجادات

برائی یا بھلائی کا جہاں تک تعلق ہے کوئی عمل دنیا میں بُرا ہے نہ اچھا ہے۔ دراصل کسی عمل میں معانی پہنانا اچھائی یا برائی ہے۔ معانی پہنانے سے مراد نیت ہے عمل کرنے سے پہلے انسان کی نیت میں جو کچھ ہوتا ہے وہی خیر یا شر ہے۔

آگ کا کام جلانا ہے۔ ایک آدمی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے آگ کو کھانا پکانے میں استعمال کرتا ہے تو یہ عمل خیر ہے۔ وہی آدمی اس آگ سے لوگوں کے گھروں کو جلا ڈالتا ہے تو یہ برائی ہے۔

جن قوموں سے ہم مرعوب ہیں اور جن قوموں کے ہم دست نگر ہیں ان کی طرزِ فکر کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سورج کی طرح روشن ہے کہ سائنس کی ساری ترقی کا زور اس بات پر ہے کہ ایک قوم اقتدار حاصل کرے اور ساری نوعِ انسانی اس کی غلام بن جائے یا ایجادات سے اتنے مالی فوائد حاصل کئے جائیں کہ زمین پر ایک مخصوص قوم یا مخصوص ملک مال دار ہو جائے اور نوعِ انسانی غریب، اور مفلوک الحال بن جائے کیوں کہ اس ترقی میں اللہ کے ذہن کے مطابق نوعِ انسانی کی فلاح مضمر نہیں ہے۔ اس لئے یہ ساری ترقی نوعِ انسانی کے لئے اور خود ان قوموں کے لئے جنہوں نے جد و جہد اور کوشش کے بعد نئی نئی ایجادات کی ہیں، مصیبت اور پریشانی بن گئی ہے۔ مصیبت اور یہ پریشانی ایک روز ادبار بن کر زمین کو جہنم بنا دے گی۔

جب تک آدمی کے یقین میں یہ بات رہتی ہے کہ چیزوں کا موجود ہونا یا چیزوں کا
عدم میں چلے جانا اللہ کی طرف سے ہے اس وقت تک ذہن کی مرکزیت قائم رہتی ہے
اور جب یہ یقین غیر مستحکم ہو کر ٹوٹ جاتا ہے تو آدمی ایسے عقیدے اور ایسے دکھوں میں
گرفتار ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ ذہنی انتشار ہوتا ہے، پریشانی ہوتی ہے، غم اور خوف ہوتا
ہے حالاں کہ اگر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ انسان کا ہر عمل، ہر فعل، ہر
حرکت کسی ایسی ہستی کے تابع ہے جو ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ ماں کے پیٹ میں
بچے کا قیام، نو مہینے تک نشوونما کے لئے غذا کی فراہمی، دودھ کی غذائیت سے ایک
اعتدال اور توازن کے ساتھ بچے کا بڑھنا، چھوٹے سے بچے کا بڑھ کر سات فٹ کا ہو جانا،
جوانی کے تقاضے، ان تقاضوں کی تکمیل میں وسائل کی تکمیل، وسائل فراہم ہونے
سے پہلے وسائل کی موجودگی۔ اگر اللہ زمین کو منع کر دے کہ وہ کھیتیاں نہ اگائے تو حصولِ
رزق مفقود ہو جائے گا۔ شادی کے بعد والدین کے دل میں یہ تقاضا کہ ہمارا کوئی نام لینے والا
ہو، اس جذبے میں انتہائی شدت اور اس کے نتیجے میں ماں باپ بننا، ماں باپ کے دل
میں اولاد کی محبت صرف آدمی کے دل میں مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ جذبہ اللہ کی ہر مخلوق میں
مشترک ہے۔ اور اسی محبت کے سہارے ماں باپ اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہیں، اُن کی
کی نگہداشت کرتے ہیں اور ان کے لئے وسائل فراہم کرتے ہیں۔

عام طور سے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ محنت اور جدوجہد بغیر وسائل کا حصول ناممکن
ہے جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جن وسائل کے حصول کے لئے ہم جدوجہد اور کوشش کرتے ہیں
وہ ایک قاعدے اور قانون کے تحت پہلے سے موجود ہیں۔ کسان جب محنت کر کے زمین
میں بیج ڈالتا ہے تو اس بیج کی نشوونما سے انسانی ضروریات کے لئے قسم قسم کی غذائیں

فراہم ہوتی ہیں۔ یہ سب اس وقت ممکن ہوتا ہے جب پہلے سے وسائل موجود ہوں مثلاً
بیج کا موجود ہونا، زمین کا موجود ہونا، زمین کے اندر بیج کو نشوونما دینے کی صلاحیت کا
ہونا، بیج کی نشوونما کے لئے پانی کا موجود ہونا، چاندنی کا موجود ہونا، ہوا کا موجود ہونا اور
موسم کے لحاظ سے سرد و گرم فضا کا موجود ہونا، اگر بیج موجود نہ ہو یا زمین کے اندر بیج
کو نشوونما دینے کی صلاحیت موجود نہ ہو، پانی موجود نہ ہو، ہوا موجود نہ ہو تو انسان کی ہر
کوشش بے کار ہو جائے گی۔

اللہ کا وصف یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو تخلیق کرتا ہے تو اس تخلیق سے اربوں، کھربوں
تخلیقات وجود میں آتی ہیں۔ موجودہ دور میں بجلی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اللہ کی
ایک ذیلی تخلیق بجلی (ELECTRICITY) ہے۔ اس بجلی کے ذریعے ہزاروں ایجادات
منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اور آئندہ آتی رہیں گی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہمارے اوپر یہ
راز منکشف ہوتا ہے کہ اللہ نے وسائل اس لئے تخلیق کئے ہیں کہ نوعِ انسان ان وسائل
کے اندر مخفی قوتوں کو تلاش کر کے ان سے کام لے اور جب قوم ان مخفی صلاحیتوں کی تلاش میں
لگ جاتی ہے تو اس کے اوپر اللہ کی طرف سے نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں اور جب وہ
انکشافات کی روشنی میں تفکر کرتی ہے تو نئی نئی ایجادات وجود میں آتی رہتی ہیں۔ قلندر شعور
ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں سب دو رخوں پر قائم ہیں۔
تخلیق کا ایک رُخ ظاہر ہے اور دوسرا رُخ باطن ہے۔ پانی ایک سیال چیز ہے۔ یہ اس کا
ظاہری رُخ ہے لیکن جب پانی کے اندر مخفی صلاحیتوں کو تلاش کیا جاتا ہے تو اس کی بے شمار
صلاحیتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اسی طرح لوہے کی مثال ہے۔ لوہا بظاہر ایک دھات
ہے۔ لوہے کی ذات کے اندر جب کوئی شخص مخفی قوتوں کو تلاش کر لیتا ہے تو نئی نئی

اختراعات اور ایجادات اس کے ارادے اور اختیار سے بنتی رہتی ہیں۔

جب ہم کسی چیز کے اندر اللہ کی صفات تلاش کرتے ہیں تو ہمارے اوپر یہ منکشف ہوتا ہے کہ پوری کائنات موجود ہے۔ کائنات میں جو کچھ بنایا گیا ہے یا زمین میں جو کچھ موجود ہے سب انسان کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔

استغنا سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی روپے پیسے کی طرف سے بے نیاز ہو جائے، چونکہ روپے پیسے اور خواہشات سے کوئی بندہ بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ضروریاتِ زندگی اور متعلقین کی کفالت ایک لازمی امر ہے اور اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ استغنا سے مراد یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کرے اس عمل میں اس کے ساتھ اللہ کی خوشنودی ہو۔ اور اس طرزِ فکر یا عمل سے اللہ کی مخلوق کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچے۔ ہر بندہ خود خوش رہے اور نوعِ انسانی کے لئے مصیبت اور آزار کا سبب نہ بنے۔ ضروری ہے کہ بندہ کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو کہ کائنات میں موجود ہر شے کا مالک درروبست اللہ ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے زمین کو اور بیج کو یہ وصف بخشا ہے کہ بیج درخت میں تبدیل ہو جائے اور زمین اس کو اپنی آغوش میں پروان چڑھائے، پانی درختوں کی رگوں میں خون کی طرح دوڑے، ہوا روشنی بن کر درخت کے اندر کام کرنے والے رنگوں کی کمی کو پورا کرے، دھوپ درخت کے ناپختہ پھلوں کو پکانے کے لئے مسلسل ربط اور قاعدے کے ساتھ درخت سے ہم رشتہ ہے۔ چاندنی پھلوں میں مٹھاس پیدا کرے۔ زمین کی یہ ڈیوٹی ہے وہ ایسے درخت اگائے جو انسان کی ضروریات کو پورا کرے۔ درختوں کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ ایسے پتے اور پھل پیدا کریں کہ جن سے مخلوق کی ضروریات موسم کے لحاظ سے پوری ہوتی رہیں۔

(کتاب "قلندر شعور" سے اقتباس) ●●●

بُت پرستی

مذہب کے بارے میں جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو ابتدائی طور پر جس احساس سے واسطہ پڑتا ہے وہ خوف اور ڈر کا احساس ہے۔ ہمارے رہنماؤں نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ مذہب کے سلسلے میں اس احساس کی امتیازی خصوصیت کو متعین کر دیں۔ احساس کی درجہ بندی کی گئی تو کئی طبقے وجود میں آئے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ —

"اَن دیکھی کسی ایک قوت کے محتاج ہونے اور اس پر اپنی زندگی کا انحصار کرنے کا نام احساس ہے۔"

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ —

"احساس خوف سے پیدا ہوتا ہے۔"

تیسرا گروہ احساس کا تعلق جنسی زندگی سے جوڑتا ہے۔ چوتھا گروہ کہتا ہے کہ احساس ایک لامحدود اور غیر متغیر ہستی کے احساسات کی انسپائریشن (INSPIRATION) ہے۔

ایک عام آدمی ان اختلافات کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں لامحالہ یہ شک جنم لیتا ہے کہ فی الواقع احساس کوئی چیز ہے بھی یا نہیں اور شک ایسی بھول بھلیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ آدم زاد مذہب سے انکار کر دیتا ہے۔

مذہب کا مضمون اتنا گہرا اور وسیع ہے کہ اس کی پوری وسعت کا احاطہ

کرنے کا دعویٰ ایک لایعنی اور فضول بات ہے لیکن اپنی دانست اور کم شعوری کے دائرے میں رہتے ہوئے اگر مذہب کی تعریف کی جائے تو دو رُخ سامنے آتے ہیں۔ مذہب کا ایک رُخ شرعی ہے اور دوسرا رُخ شخصی یا ذاتی ہے۔ مذہب کی ایک شاخ ایک واحد ہستی کو ماننے کا دعویٰ کرتی ہے اور دوسری شاخ عقلی دلائل اور شخصی توجیہات سے انسانی نفسیات کا ذکر کر کے نظر نہ آنے والی ہستی کا انکار کرتی ہے شخصی مذہب سیاسی مذہب ثابت ہوا ہے اور شرعی مذہب چاہتا ہے کہ عبادت، قربانی اور دیگر شعائر کے تحت ایک ضابطۂ حیات بنا کر ایسی تنظیم قائم کی جائے جہاں پوری نوع انسانی ایک پلیٹ فارم پر آجائے۔

شرعی مذہب کے پیروکار خوف کے احساس کے ساتھ ماوراہستی کی پرستش کرتے ہیں لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ماوراہستی کو آدمی دیکھ نہیں سکتا۔ ایک اور گروہ جسے صوفیا کہا جاتا ہے اس کا کہنا ہے کہ ماوراہستی ہرگز کوئی خوفناک ہستی نہیں ہے۔ یہ ماوراہستی ماں سے ستر گنا زیادہ محبت کرتی ہے۔ یہ کبھی مشاہدہ میں نہیں آیا کہ ماں نے اپنے بچے کو آگ کے الاؤ میں جھونک دیا ہو۔ اس گروہ کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ ہر خاص و عام ماوراہستی کو دیکھ سکتا ہے۔ اور دُنیا میں لاتعداد شماریات سے زیادہ ایسی مثالیں، ایسے واقعات اور کیفیات موجود ہیں جو ہزاروں سال پر محیط ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ ڈر اور خوف دو انسانوں کے درمیان، ایک انسان اور درندہ کے درمیان، ایک انسان اور سانپ کے درمیان دُوری اور بُعد کی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں اس کے متضاد محبت سے قربت کا احساس وجود میں آتا ہے۔

جب دُوری واقع ہوتی ہے تو لامحالہ ذہن میں خوف اور وسوسے در آتے ہیں

جیسے جیسے قربت کا احساس کم ہوتا ہے، آدم زاد اپنا خوف کم کرنے کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے کئی صورتیں بنا لیتا ہے اور اس نقطۂ ارتکاز سے بُت پرستی شروع ہو جاتی ہے۔ بتوں کی موجودگی آدم زاد کے اندر سے حقیقت کا جوہر ختم کر دیتی ہے۔ حقیقت کے جوہر سے محرومی کا نام جادو ہے۔ اس مقام سے انسانی نفسیات میں عجیب عجیب شگوفے پھوٹتے ہیں پھر یہ شگوفے اپنی ایک طرزِ فکر اور طرزِ استدلال بنا لیتے ہیں اور برملا اس بات کا اعلان ہو جاتا ہے کہ مذہب اور روحانیت محض خیالی چیز ہے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ اگر اس استدلال کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مذہب اور روحانی کیفیات محض خیال ہیں تو پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لامذہبیت، کفر اور وسوسوں سے معمور احساسات بھی خیالی باتیں ہیں۔ صوفیا حضرات یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر ہم یہ فرض کر بھی لیں کہ روحانیت اور مذہب خیالی تانے بانے پر بنا ہوا ہے تو اس حقیقت کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے کہ ایک مذہبی روحانی آدمی کے اندر سکون ہوتا ہے، قناعت ہوتی ہے، وہ ایسے کام کرتا ہے جن کاموں سے اس کی نوع اور انسانی برادری کو آرام ملتا ہے۔ اس کے اندر ایسی غیر مرئی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن قوتوں میں عوام الناس کی فلاح مضمر ہے۔ اس کے برعکس لامذہب لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو باوجودیکہ ان کے پاس دنیاوی وسائل کے انبار ہیں مگر ان کے اندر وہ سکون نہیں ہوتا جو ایک روحانی آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ یہ بات ہر بالغ اور باشعور آدمی کے سامنے ہے کہ جو شخص کمینی حرکت کرتا ہے، اس کی زندگی میں پستی اور ناہمواری داخل ہو جاتی ہے۔ ناپاک شے کو دھو دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔ انصاف پسند شخص کے اندر خدا کا عدل ہوتا ہے۔ عدل، انصاف، مروّت اور رحم دلی کے نتیجے میں ماوراہستی انسان کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔

ریاکار اور دھوکے باز شخص۔ مطلب پرست اور معصیت ناآشنا شخصیتیں چونکہ خود کو دھوکا دیتی ہیں اس لئے منافقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے اندر دوسرا عفریت داخل ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں آدم زاد جو فرشتوں کا مسجود ہے اپنی ذات سے ناآشنا ہو جاتا ہے۔

اہلِ نظر اور بصیرت والے بڑے لوگ کہتے ہیں کہ سیرت کے تاثرات کبھی چھپے نہیں رہتے۔ یہ ایک مسئلہ ہے کہ خیرات کرنے والے لوگ کبھی مفلس نہیں ہوتے۔ زندگی کے اعمال میں جھوٹ کی تھوڑی سی آمیزش بھی قول و فعل میں تضاد پیدا کر دیتی ہے۔ سچ ایک ایسی حقیقت ہے جو زمین کے ایک ایک ذرہ کو منور کرتی رہتی ہے اور زمین کا ایک ایک ذرہ پکار کر اعلان کرتا ہے کہ یہ انسان سچ کا پیامبر ہے۔ کیا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ خدا کا ذکر ہے۔ اس کے وجود میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

آیئے، اس فلسفیانہ بحث کو چھوڑ کر نتیجہ پر غور کریں۔ اللہ، بھگوان، نروان، گاڈ، ایل، ایلیا، ماوراء ہستی ہر خاص و عام کی سرپرست ہے، نگراں ہے، ابتدا ہے اور انتہا ہے۔ نگراں ذات سے خوف بندہ کو دور عمیق سمندر میں پھینک دیتا ہے محبت سے قربت کا احساس جنم لیتا ہے۔ ماوراء ہستی اللہ سے جتنی محبت کی جائے وہ ہستی اسی مناسبت سے دس گنا بندے کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ دوستی کا وصف قربت ہے نہ کہ دوری۔ دوست کو دوست سے نہ خوف ہوتا ہے اور نہ غم۔

آدم و حوا کے بیٹوں اور بیٹیوں کو عہد کرنا چاہیئے کہ ماوراء ہستی اللہ سے آج کے بعد ڈریں گے نہیں۔ اس سے محبت کریں گے اس لئے کہ ماوراء ہستی خود اعلان کر رہی ہے "اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہوتا ہے اور نہ انہیں غم ہوتا ہے۔" ●

ماورائی ڈوریاں

تصوف کی تاریخ میں یہ مسئلہ متنازعہ فیہ رہا ہے کہ انسان کے اندر جب اس کی روحانی قوتیں متحرک اور کارفرما ہوتی ہیں تو کیسے سمجھا جائے کہ ان حالتوں میں حقیقت کی رنگینی ہے یا شیطان کی کارفرمائی۔ مذہب میں بھی اس مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ روحانی واردات و کیفیات اگر حقیقت پر مبنی نہ ہوں تو اس بات کا گمان یقین بن جاتا ہے کہ شیطانی الہام آدم زاد کو نچلے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔ جہاں تک مرشد اور گرو کی تعلیمات کا تعلق ہے اس میں یہ بات قابلِ اعتراض رہی ہے کہ ایک مرشد سینکڑوں یا ہزاروں میل دور بیٹھ کر مرید کی کس طرح تربیت کرتا ہے۔ اور اگر وہ روحانی طور پر تربیت کر بھی سکتا ہے تو وہ کون سا یقینی امر ہے جس کے بارے میں کہا جائے کہ مرشد کی روح شیطانی الہام سے مبرا ہے۔ مرشد بہرحال ہماری طرح کا ایک انسان ہے۔

انسانی زندگی کے بارے میں دانشوروں کا تجزیہ ہے کہ زندگی دراصل خیالات کی ایک فلم ہے اور یہ فلم دماغی اسکرین پر تسلسل اور تواتر کے ساتھ ڈسپلے (DISPLAY) ہو رہی ہے۔ خیالات کے بارے میں غور و فکر ہمیں اس حقیقت سے آشنا کرتا ہے کہ ایک ہی خیال کو مختلف معانی پہنانے کا نام تکمیل ہے۔ جب ہم بھوک کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو پیٹ بھرنے کے ایک مخصوص عمل کو اچھا قرار دیتے ہیں اور پیٹ بھرنے کے اسی عمل کو بُرائی

سے منسوب کرتے ہیں۔ شادی ایک عمل ہے جس کے اوپر نوعِ انسانی کی بقا کا انحصار ہے اگر اس عمل کی انسان کے اپنے بنائے ہوئے قاعدوں اور ضابطوں کے ساتھ تکمیل ہوتی ہے تو یہ عمل خیر ہے اور یہی عمل متعین قاعدوں اور ضابطوں کے خلاف کیا جائے تو برائی ہے حالاں کہ نتائج کے اعتبار سے عمل کے دونوں رخوں کا ایک ہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

عمل کی پہچان یہ ہے کہ ایک عمل کرنے سے ضمیر خوش ہوتا ہے اور اس کے اندر سکون و اطمینان کی لہریں موجزن ہوتی ہیں۔ اور عمل کی دوسری پہچان یہ ہے کہ ضمیر ناخوش ہوتا ہے اور انسان یہ عمل کر کے ندامت محسوس کرتا ہے۔

انسان دراصل ایک درخت ہے اور اس کی زندگی کے اعمال و کردار اس درخت کے پھل ہیں۔ یہ بات بھی ہم سب کے سامنے ہے کہ درخت اپنی جڑ سے نہیں اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال انسانی اعمال کی ہے۔ صداقت کا فیصلہ ماخذ سے نہیں اس کے نتائج سے مرتب ہوتا ہے۔ کسی شخص کے اندر نیکی کے تصورات یا برائی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کا خود اپنا عمل اس کا یقین دلاسکتا ہے کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ کسی عمل کو پرکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ عمل معاشرہ پر کس طرح اثرانداز ہو رہا ہے۔ اگر اس عمل میں سچائی، گہرائی اور فطرت موجود ہے تو یہ عمل صحیح اور سچا ہے۔

جن لوگوں کے جسمانی تقاضے روحانی کیفیات سے ہم رشتہ رہتے ہیں ان کا طرزِ تکلم اور طریقۂ تعلیم اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ بندہ جسم و جان کے رشتے سے واقف ہے۔ روح اور جسم کے مشترک نظام میں جب حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو انسان خود کو خوشی اور ایثار کے جذبے میں ڈوبا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہ نوعِ انسانی کے

ہر فرد کو اور کائنات کے تمام افراد کو اس نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے ایک ماں اپنے بچوں کو دیکھتی ہے۔ اس کی سرشت میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ میرا رشتہ کائنات کے تمام افراد سے قائم ہے۔ جس طرح کائنات میرے اندر بسی ہوئی ہے اسی طرح کائنات کا ہر فرد میرے دل کے آئینے پر اپنا عکس ڈال رہا ہے۔ وہ جب چاہے اپنے اندر اس عکس سے پیغام و سلام کر سکتا ہے۔

شیطانی تفکر، ابلیسی طرزِ فکر اور برائی کے تشخص ہستی کی سوچ یہ ہے کہ وہ اپنا عرفان اس طرح رکھتا ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ کبر و نخوت اس کی گردن کے پٹھوں کو تشنج میں مبتلا کر دیتی ہے، چہرہ پر ملاحت، صباحت اور معصومیت کی جگہ بدصورتی اور خشکی اپنا تسلط جما لیتی ہے۔

ایک اپنے ہی جیسے انسان کے پاس بیٹھنے سے سرور ملتا ہے اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی قربت تکدر اور بھاری پن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ہر انسان پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک تجربات کی ایک دستاویز ہے۔ دستاویز میں بھلائی سرایت کر گئی ہے تو دستاویز قیمتی اور فائدہ مند ہے۔ رگ و پے میں اگر برائی رچ بس گئی ہے تو دستاویز بھیانک اور بھونڈی ہے۔ بہترین دستاویز انسان کے لئے خود آگہی کا ذریعہ ہے خود آگہی ایک لامتناہی راستہ ہے جس راستے پر چل کر کوئی انسان ایسا درخت بن جاتا ہے جس کے پھل میٹھے اور شیریں ہوتے ہیں۔ ایک عالم اس سے سیراب ہوتا ہے۔ اس کی ٹھنڈی چھاؤں سے سکون اٹھاتا ہے۔ بھونڈی دستاویز انسان کے اندر بے حسی اور خود غرضی اور لالچ پیدا کرتی ہے یہ انسان کانٹوں بھرا ایسا درخت ہوتا ہے جس کے نیچے ایک دو گھڑی بھی کوئی بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔

اگر انسان کے اندر خود سکون ہے وہ دوسروں کے لئے طمانیتِ قلب کا ذریعہ ہے۔ اس کا سایہ ٹھنڈا اور عطر بیز ہے۔ اس کی روحانی کیفیات حقیقی ہیں اور اگر انسان خود سکون سے دور ہے، اس کے اوپر غم کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ وہ خوف اور ڈر کے خشک اور بے آب وگیاہ پہاڑوں کے دامن میں گراہ رہا ہے۔ یہ کیفیت شیطانی الہام ہے اور اس کی ساری زندگی دھوکا ہے۔

زندگی کی اچھی دستاویز رکھنے والا انسان خدا کے ساتھ قریبی تعلق رکھتا ہے۔ اور خدا کی قربت سے لطف اٹھاتا ہے۔ خدا کا ملاپ اسے بے طلب اور بے توقع ملتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر سانس میں خدا سے قربت محسوس کرتا ہے۔ خدا کو اپنے اندر جلوہ گر دیکھتا ہے، جو خدا کہتا ہے وہ سنتا ہے اور جو خود کہتا ہے خدا اُسے قبول کر لیتا ہے۔ خدا سے ہم کلامی میں زندگی کے ماہ وسال، مفروضہ حواس اور عادات واطوار اس سے عارضی طور پر محو ہو جاتے ہیں۔ پھر اس پر زندگی کے وہ راز منکشف ہوتے ہیں جو عالمین کو معلوم نہیں ہوتے۔ اس احساس کی بدولت انسان اپنی اصل کو پہچان لیتا ہے اور وہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کا جینا مرنا اور ایک عالم سے دوسرے عالم میں زندگی گزارنے میں کیا اسرار ہیں۔ ایسا بندہ ہر آن اور ہر لمحہ خدا کے وجود کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ جسمانی طور پر بندہ عام انسانوں کی طرح ہوتا ہے لیکن اس کے اندر واحد نقطہ الٰہی تجلی سے روشن اور چارج (CHARGE) ہوتا رہتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس نقطہ کے ساتھ ساری کائنات لہروں کی ماورائی ڈوریوں میں بندھی ہوئی ہے۔

●●●

مرکزی نقطہ

انسان ایسی زندگی چاہتا ہے جو فنا سے ناآشنا ہو۔ ایسی صحت چاہتا ہے جو بیماریوں سے متاثر نہ ہو۔ ایسی جوانی چاہتا ہے جو بڑھاپے میں تبدیل نہ ہو۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو جاتی ہے، صحت اور تندرستی کے اوپر بیماریوں کا غلبہ ہوتا رہتا ہے۔ انسان زندگی کے نشیب وفراز سے کتنا ہی فرار چاہے کامیاب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ دنیا میں کوئی چیز بے ثباتی سے خالی نہیں۔ فنا اور تخریب کا عمل ہر وقت جاری وساری ہے۔

انسان کے اوپر جب بے ثباتی کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ تکلیف کے بارے میں زیادہ حساس ہو جاتا ہے۔ تکلیف اور غم کے عالم میں ایسے ایسے احساسات نمودار ہوتے ہیں جن سے انسان غمگین اور پریشان خیال بن جاتا ہے۔ زندگی کی ساری چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے اور شان وشوکت افسردہ ہو کر ٹھٹھر جاتی ہے۔

انسان پیدائش کے بعد سے بڑھاپے تک مسلسل ایک جنگ لڑتا ہے۔ وہ ہر حال میں فتح یاب ہو کر سرخرو ہونا چاہتا ہے لیکن بالآخر جیت بڑھاپے کی ہوتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ موت بڑھاپے کے اوپر چھا جاتی ہے۔ حیات کی ابتدا کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہو انتہا لازمی طور پر فنا ہے۔ ہر آن اور ہر لمحہ انسان کو موت کی آنکھ گھورتی رہتی ہے۔

ایک مکتبۂ فکر کا خیال ہے کہ انسان کی خوشی اس میں ہے کہ وہ آزادانہ زندگی گزارے

لیکن جب ان لوگوں نے زندگی کی فنائیت پر سوچنا شروع کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان کسی بھی حال میں آزاد نہیں ہے۔ اسی فلسفے میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ ہر مسرت کے بعد کسی آفت کا آنا لازمی ہے۔ ہر سکھ اور چین کے بعد کوئی نہ کوئی فتنہ برپا ہوتا ہے۔ ہر خوشی دراصل ایک غم کا پیش خیمہ ہے اور ہر سکون اضطراب اور بے چینی پر ختم ہوتا ہے

ہر خوشی اک وقفۂ تیاریِ سامانِ غم
ہر سکوں مہلت برائے امتحان و اضطراب

عام مشاہدہ یہ ہے کہ سکھ ہو یا چین، مصیبت ہو یا پریشانی، لڑکپن ہو یا جوانی ہر چیز پر موت حاوی ہے۔ غور کیا جائے تو زمین پر بسنے والی تمام مخلوقات میں، انسان سب سے زیادہ مظلوم اور مصیبت زدہ ہے۔ موت جب اس کے سامنے آ کھڑی ہو جاتی ہے تو انسانی زندگی کی ساری جدوجہد بے کار محض دکھائی دیتی ہے۔ انسان زندہ رہتا ہے اور زندگی میں اتنے دکھ جھیلتا ہے کہ جب دکھ اور سکھ کے اعداد و شمار جمع کئے جاتے ہیں تو ساری زندگی دکھوں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ آدمی برہنہ پیدا ہوتا ہے اور برہنہ چلا جاتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے آیا، کیوں آیا اور کہاں چلا گیا۔ خبر متواتر ہمیں بتاتی ہے کہ انسان عدم سے وجود میں آیا اور پھر عدم میں چلا گیا۔ یعنی انسان کی تمام جدوجہد، ہر قسم کی کوشش، زندہ رہنے کی تگ و دو سب عدم ہے۔ زندگی ایک پروگرام کے تحت آدم زاد کو وسائل اور خورد و نوش کے ساتھ متحرک رکھتی ہے۔ آدم زاد جانوروں کو کھلا پلا کر موٹا تازہ کرتا ہے اور ذبح کر کے کھا جاتا ہے۔ جس طرح آدم زاد جانوروں کو کھاتا ہے اسی طرح موت آدم زاد کو کھا لیتی ہے۔

زندگی سے مردانہ وار لڑ کر فتح یاب ہونے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ

انسان جدوجہد اور کوشش کی حقیقت سے واقف ہو جائے۔ واقفیت یہ ہے کہ زندگی ایک روٹین (ROUTINE) میں گزار دی جائے۔ روٹین یہ ہے کہ ہم سانس لیتے ہیں لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ہم سانس لے رہے ہیں۔ پلک جھپکتی رہتی ہے لیکن ہم یہ نہیں سوچتے کہ پلک جھپک رہی ہے۔

حقیقی طرزِ فکر یہ ہے کہ کسی سے توقع نہ رکھی جائے اس لئے کہ جو بندہ کسی سے توقع نہیں رکھتا وہ ناامید بھی نہیں ہوتا۔ امیدیں توازن کے ساتھ کم سے کم رکھنی چاہئیں اور ایسی ہونی چاہئیں جو آسانی کے ساتھ پوری ہوتی رہیں۔

آسمانی کتابوں کے مطابق سکون حاصل کرنے کا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ انسان غصہ نہ کرے اور کسی بات پر پیچ و تاب نہ کھائے۔ عمل جدوجہد میں کوتاہی نہ برتے اور نتیجہ کے اوپر نظر نہ رکھے۔ زمین پر بسنے والی نوعیں زندگی کے جن اصولوں پر کاربند ہیں ان کا مطالعہ کیجئے عارضی (FICTION) زندگی کی اکائیوں کو یکجا کر لیا جائے تو شہادت فراہم ہوتی ہے:-

قانونِ فطرت میں کہیں جھول نہیں ہے۔ ہر چیز وقت کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ وقت جس طرح چابی دیتا ہے شے حرکت میں آجاتی ہے۔ وقت اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے تو چابی کھلونے میں ختم ہو جاتی ہے۔ کل پرزے سب ہوتے ہیں لیکن قوت (ENERGY) باقی نہیں رہتی۔ وقت (TIME) قوت کا مظاہرہ ہے، قوت ایک توانائی ہے، ایک مرکز ہے اور اسی مرکز کو آسمانی کتابیں قدرت کے نام سے متعارف کراتی ہیں۔ قدرت قائم بالذات ہے، ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے جس نقطہ کے ساتھ پوری کائنات کے افراد بندھے ہوئے ہیں۔ وجود اور عدم وجود دونوں اس میں گم ہیں۔

انسان جب اس مرکزی نقطہ سے اپنا رشتہ تلاش کرلیتا ہے تو دنیا (FIC-TION) سے اس کی ساری توقعات ختم ہو جاتی ہیں۔ اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو مسرتیں اس کے گرد طواف کرتی ہیں ——— اور ——— موت کی آنکھ اُسے ماتا کی آنکھ سے دیکھتی ہے۔ اس کے قریب آنے سے پہلے دستک دیتی ہے اور اجازت کی طلب گار ہوتی ہے۔

●●●

پیاسی زمین

اگر ہم عقائد کا تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مذہب کا مدار ایمان بالغیب پر ہے یعنی اس یقین پر کہ غیب میں حقائق ہیں نظر نہیں آتے لیکن اس کے باوجود ہماری فلاح اسی میں ہے کہ ہم ان دیکھی حقیقتوں پر ایمان لائیں اور اپنے ذہن و عمل کا تعلق غیب کی دُنیا سے قائم رکھیں۔

مذاہب اور ان کے معبود جن کی لوگ پوجا کرتے ہیں، محض تصوراتی دنیا ہے محسوس طرزوں میں ان معبودوں کو نہ دیکھا جاسکتا ہے اور نہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ موجود اور محسوس مذہبی چیزوں کے علاوہ مذہب کے اندر اور بھی تصورات ہوتے ہیں جو انسانی زندگی اور اس کے اعمال وافعال پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

آج کی جگ مگ کرتی ترقی یافتہ روشن دنیا میں بھی ایک مکتبۂ فکر کہتا ہے کہ کائنات کی ماہیت، رُوح اور موت کے بعد کی زندگی جیسے موضوعات میں سے کوئی چیز ہمارے لئے علمی کوشش اور فکر کا موضوع نہیں بن سکتی کیوں کہ ہمارے تصورات اور ہمارے شعوری محسوس علم کے لئے ضروری ہے کہ ان میں محسوسیت اور متشکل شکلیں داخل ہوں۔ مذہبی موضوعات اور عقائد میں چوں کہ معین محسوسات نہیں ہیں، اس لئے یہ شعبہ علمی لحاظ سے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انسان کی زندگی کا یہ عجیب مظہر ہے کہ انسان پوری قوت کے ساتھ ایسی چیزوں کے وجود کا یقین رکھتا ہے جس کی نسبت وہ صحیح معنوں میں تصور بھی قائم نہیں کرسکتا۔

کم و بیش یہی صورت حال چودہ سو سال پہلے بھی تھی۔ لوگوں نے محسوس طرزوں کی بنیاد پر نئے نئے بُت تراش لئے تھے۔ ہر طرف گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ یونان، روما اور بحیرۂ روم کے گرد و پیش آسمانی مذاہب اپنی توانائی کھو چکے تھے سلطنت کی پرستش روما الکبریٰ کا مذہب تھا اور شاہ پرستی لوگوں کا ایمان و دھرم تھا۔

یونان، روم، مصر و شام اور ہندوستان کے تہذیب و تمدن ظاہری عروج پر ہونے کے باوجود اخلاقی پستی میں گرے ہوئے تھے۔ جہالت اور بت پرستی کا دَور دورہ تھا۔ فسق و فجور، عیش کوشی، توہم پرستی، بدکاری اور بے حیائی نے انسانی معاشرے پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ آدم زاد برادری میں جس کے ہاتھ میں طاقت تھی وہ خدا بن بیٹھا تھا۔ یہ بھی تمیز نہیں رہی تھی کہ ہمارے ہی جیسا ایک بندہ جو ہماری طرح بھوک اور پیاس کا محتاج ہے، بول و براز سے مستثنیٰ نہیں ہے کیسے خدا ہو سکتا ہے۔ کوئی قانونی حد متعین نہیں تھی۔ کوئی کسی ضابطہ کا پابند نہیں تھا۔ انتہا یہ کہ اپنے ہی وجود میں سے پیدا ہونے والے وجود کو قتل کرنا روا تھا۔ دختر کُشی، قمار بازی، مے نوشی اور بداخلاقی عام تھی۔ یہی وہ تاریک دور تھا جب سوکھی اور پیاسی زمین نے اور زمین کے اوپر بسنے والی مخلوق نے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں اور آسمانوں سے اُس پار عرش پر مکین اس ہستی کو جو سب کا خالق ہے اور جس نے محبت کے ساتھ پیدا کیا ہے، زمین کے اوپر رحم آگیا۔ اور اس نے اپنے نور کا ایک حصہ زمین پر اتار دیا تاکہ تاریکی روشنی میں بدل جائے، پیاسی زمین سیراب ہو جائے اور اندھوں کو آنکھیں، گونگوں کو زبان اور بہروں کو کان مل جائیں۔ انسانیت کا بھرم جو بکھر چکا ہے دوبارہ قائم ہو جائے۔

انسانی تاریخ کے بھیانک، دہشتناک اور نفسا نفسی کے اس گھٹن دور میں ایک عظیم

انسان پیدا ہوا، ایسا عظیم انسان جو سراپا رحمت تھا اور رحمت ہے۔ آپ ایسی قوم میں پیدا ہوئے جو سرتاسر ظلم و جہالت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں یہ روشن مینار جلوہ نما ہوا تو دشمنوں نے بھی آپ کے صادق اور امین ہونے کا اعتراف کیا۔ مکہ کے بوڑھے، بچے، جوان مرد و زن آپؐ کے اوپر اعتماد کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے اہل مکہ کو جمع کر کے کہا۔

"اگر میں کہوں پہاڑ کی دوسری جانب ایک بہت بڑا لشکر جمع ہے جو تم پر حملہ کرنیوالا ہے تو تم مان لو گے؟"

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ "بے شک ہم یقین کریں گے کیوں کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

لیکن جب اس صادق ذات بابرکت نے اوہام پرستی اور اپنے ہاتھوں سے تراشیدہ بتوں کی پرستش سے منع کیا اور خدا کا پیغام سنایا تو وہ سب آپ کے دشمن بن گئے۔ آپ کو گالیاں دیں، پتھر مارے، راستے میں کانٹے بچھائے، گلے میں پھندا ڈال کر آپ کو گھسیٹا نماز میں بحالت سجدہ آپؐ کے اوپر گندگی پھینکی، راستہ گزرتے آپؐ کے اوپر کوڑا کرکٹ پھینکا گیا۔ یہ سب کیوں ہوا، اہل قریش کی یہ دشمنی اور عناد کیوں تھا؟ اس لئے کہ ہادیٔ برحق نے تاریک دُنیا میں نور کی شمع جلا دی تھی۔ نوعِ انسان کے قافلہ کو ہلاکت سے بچانے کے لئے سیدھی راہ دکھادی تھی۔ اللہ کے اس محبوب بندے کو چند قدسی نفس حضرات کی ایک جمعیت مل گئی تو ظالموں نے آپؐ کے پیروکاروں کو بھی نہیں بخشا۔ ان کو گرم ریت پر لٹایا، ان کے ہاتھوں پر کیلیں گاڑیں، ہاتھ اور پیر باندھ کر جھلستی ہوئی دھوپ میں ریگستان کی تپتی ہوئی ریت پر ان کے جسموں کو گھسیٹا۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم سب کچھ دیکھتے رہے۔ صبر کرتے رہے، کیوں؟ اس لئے کہ آپ کو رب العالمین نے رحمۃ للعالمین بنا کر

بھیجا تھا۔ یہ سزا کس جرم کی پاداش میں تھی، یہ ظلم و بربیت کیوں تھی؟ اس لئے کہ رحمۃ للعالمین اپنی آغوشِ رحمت میں لے کر لوگوں کو عذاب اور دردناک زندگی سے بچانا چاہتے تھے۔ خالقِ کائنات کا یہ محبوبؐ لوگوں کو ابدی آسائش سے رُوشناس کرانا چاہتا تھا۔ یہ کیسی حرماں نصیبی تھی کہ چاہنے والوں کو دھتکارا جا رہا تھا۔ محبت کرنے والے کے ساتھ نفرت و غصہ کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ آپؐ کے صبر و تحمل کا یہ عالم تھا کہ آپؐ اہلِ طائف کو اللہ کا پیغام سُناتے، لوگ آپؐ کو پاگل دیوانہ کہتے اور جب غصہ دور نہیں ہوتا تو پتھر مار مار کر آپؐ کو لہولہان کر دیتے۔ جب خون بہتا ہوا دیکھ کر آپؐ کے دوست (صحابہ) عرض کرتے ـــــ

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے لئے بددعا کریں" تو آپؐ فرماتے "میں لوگوں کے لئے زحمت بن کر نہیں آیا، رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جب اللہ کا وعدہ پورا ہوا تو لوگوں نے خدا کو محسوس طرزوں میں دیکھا۔ محسوس طرزوں میں خدا کی آواز سنی اور محسوس طرزوں میں اس کی قربت کو پالیا۔

●●●

وجدان

کہا جاتا ہے کہ انسانوں کو زندہ رہنے کے لئے کسی نہ کسی عقیدے کا پابند رہنا ضروری ہے۔ گرد و پیش کے حالات اور ماں باپ کی تربیت سے جس قسم کے عقائد بچے کے ذہن میں پرورش پا جاتے ہیں وہی بچے کا مذہب بن جاتا ہے۔ تمام نظریات کی بنیاد اسی اصول پر کارفرما ہے۔ اس کے بغیر تاثرات، واردات اور کیفیات کو عقیدے کے سلسلے میں کوئی جگہ نہیں ملتی۔ ہمارے تمام فلسفے اور تمام طبعی سائنس اسی کلیہ پر قائم ہیں لیکن ہم جب انسان کی ذہنی اور اندرونی زندگی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ذاتی اور باطنی واردات و کیفیات میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ اور ہم یہ اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ زندگی کا بہت تھوڑا سا حصہ عقلیت کی گرفت میں آتا ہے۔ جو کچھ ہے سب بچپن میں سُنی ہوئی، دیکھی ہوئی اور والدین سے ورثہ میں ملی ہوئی کیفیات کا ثمر ہے۔ ہم جب اسی مسئلہ کو منطقی انداز میں حل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ عقل کا رعب اور وقار تو بہت ہے لیکن فی الواقع عقل بے بس ہے کیوں کہ جہاں دلائل زیرِ بحث آتے ہیں وہاں محض الفاظ کے گورکھ دھندے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہم جب عقلی بنیادوں پر یا منطقی استدلال سے عقیدے کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمیں مایوسی اور ناکامی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایک زمانہ تھا کہ خدا کی ہستی کے ثبوت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ بے شمار دلائل نظم و نثر میں جمع کئے گئے اور ایک پورا گروہ ان دلائل اور طرزِ فکر کو پھیلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب

انسانی شعور نے کروٹ بدلی اور صدیوں پرانے منطقی استدلال کو رد کیا تو وہ ساری تقریریں اور ساری تحریریں اور موٹی موٹی کتابیں طاقِ نسیاں ہوگئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنے والی نسل کو مذہب کے بارے میں جو ثبوت چاہئے تھا وہ اُسے نہیں ملا نتیجہ میں مذہب پر سے ان کا اعتماد اٹھ گیا اور نوجوان نسل نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مذہب جس خدا کا تذکرہ کرتا ہے، اگر خدا ہے تو ہمارا خدا ایسا نہیں ہے جس طرح ہمارے آباؤ اجداد سمجھتے تھے۔ مفکر جب فکر کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ کوئی بندہ اپنے عقیدے کی وجہ بیان نہیں کر سکتا، اس لئے کہ وجہ بیان کرنے میں عقلی دلائل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ان سب کے باوجود رواں دواں زندگی میں ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ عقیدے کے بغیر کوئی فرد زندگی کو صحیح خدوخال پر قائم نہیں رکھ سکتا۔ عقیدے سے مراد عام طور سے یہ لی جاتی ہے کہ بندہ یہ کہتا ہو کہ کوئی ایسی ماورائی ہستی موجود ہے جس کے ہاتھ میں پوری کائنات کا نظام ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، جس طرح چاہتا ہے ہوتا رہتا ہے۔ بدعقیدگی یا عقیدہ کا نہ ہونا انسان کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ سب اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے لیکن بہرحال عقیدہ ہو یا بے عقیدگی انسان اپنی ذات سے ہٹ کر اندر کی دنیا کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ بے عقیدہ ہونا بھی ایک عقیدہ ہے۔ کوئی شخص اگر خدا کی ہستی اور خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے تو ہم اس کو دہریہ کے عقیدہ کا حامل کہتے ہیں جب تک مذہب اور خدا کے بارے میں ہمارے اندر فلسفی انداز اور منطقی استدلال موجود رہتا ہے ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے اس لئے کہ ماورا ہستی کو سمجھنے کے لئے ماورائی شعور کا ہونا بھی ضروری ہے۔ پس ثابت یہ ہوا کہ مذہب ماورائی ہستی اور صداقت کی اصل اساس ہمارا غیر شعوری عقیدہ

اور وجدان ہے۔ جب ہم وجدان میں قدم بڑھا دیتے ہیں تو فطرت ہماری رہنمائی کرتی ہے اور عقل اس کی پیروی کرتی ہے۔ یہ بات مشاہدہ میں ہے کہ جن لوگوں کے اوپر وجدان کی دنیا روشن ہوگئی ان لوگوں کے اندر خدا کے عدم وجود کے بارے میں خواہ کیسے بھی بلند دلائل پیش کئے گئے ان کے عقیدے میں اور ان کی طرزِ فکر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

یہ حقیقت اس طرف رہنمائی کرتی ہے کہ وجدان ایک ایسا عالم ہے جس عالم میں ہر لمحہ، ہر آن حقیقتیں عکس ریز ہوتی رہتی ہیں۔ عالمِ وجدان میں سفر کرنے والا مسافر وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے جو عقل کی پہنائیوں میں گم رہنے والا بندہ نہیں دیکھتا۔ انسانی جبلت اور فطرت کا موازنہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جبلت بے قرار اور بے سکون رکھتی ہے اور فطرت میں انسان کے اوپر سکون اور راحت کی بارش برستی رہتی ہے، اس لئے کہ فطرت براہِ راست خالقِ کائنات سے ہم رشتہ ہے اور تخلیق کرنے والی ہستی سراپا سکون اور رحمت ہے۔

نسلی اعتبار سے ہمارے بچے جس مذہب کے پیروکار ہیں انہیں جب اس مذہب میں سکون نہیں ملتا تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ سکون ایک حقیقت ہے ایسی حقیقت جس حقیقت کے ساتھ پوری کائنات بندھی ہوئی ہے۔ حقیقت فکشن نہیں ہوتی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بندے کے اندر وہ کون سی طاقت ہے جو ٹوٹ پھوٹ، گھٹنے بڑھنے اور فنا ہونے سے محفوظ ہے۔ وہ طاقت، وہ ہستی ہر بندے کی اس کی اپنی رُوح ہے۔ نسلی اعتبار سے اگر ہم اپنے بچوں کو ان کے اندر موجود رُوح سے آشنا کر دیں تو وہ خدا کے دوست بن جائیں گے۔ خدا کا فرمان ہے کہ اللہ کے دوستوں کو خوف اور غم نہیں ہوتا۔ زندگی کی ذہنی، جسمانی اور روحانی تمام مسرتیں اُن کے شاملِ حال ہوتی ہیں۔

●●●

سیلاب

ہم جب مذہب کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے دو طرزِ فکر آتی ہیں۔ ایک طرزِ فکر کے لوگ کم یاب ہیں۔ اور دوسری طرزِ فکر کے لوگ اکثریت میں ہیں۔ دونوں گروہوں کا کہنا ہے کہ وہ فضلِ الٰہی سے بہرہ اندوز ہیں۔ ایک طرزِ فکر کے لوگ اپنے نفس پر سختی کرتے ہیں لیکن دوسروں کے لئے شفیق ہوتے ہیں۔ ایک گروہ کے لوگ عام لوگوں سے اس قدر دُور ہوتے ہیں کہ خیال ہوتا ہے یہ جبلّی تقاضوں سے بہت دور ہیں اور نہایت غلط راستے پر پڑ گئے ہیں۔ ایک گروہ میں جذباتی ہیجان اور اثر پذیری بہت زیادہ ہوتی ہے اور دوسرے گروہ کے افراد اخلاقی اور عملی زندگی کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ دونوں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھروسا اللہ پر ہے اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ کے لئے کر رہے ہیں۔ لیکن دونوں گروہوں میں سے ایک گروہ کے اوپر خوف اور غم ہمیشہ مسلّط رہتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے بتاتا یہ ہے کہ غم اور خوف سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہے لیکن جیسے جیسے مذہب کے روپ میں عملی زندگی اس کے اوپر محیط ہوتی ہے وہ خوف اور دہشت و تذبذب کے جال میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ تمام جذبے اس کے سامنے سرد پڑ جاتے ہیں اور جب جذبہ شدت اختیار کر لیتا ہے تو اس جذبے کا حامل ہر فرد دوسرے فرد کو بھی اپنی طرح غم اور خوف میں مبتلا دیکھنا چاہتا ہے۔ عبادت و ریاضت کے ہر عمل کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ اس عمل سے ڈر اور خوف سے نجات ملے گی، کب ملے گی، اس کے بارے میں یقینی شہادت موجود نہیں ہوتی

اور یقینی شہادت نہ ہونے کی بنا پر ایسا انسان اپنی شخصیت کھو بیٹھتا ہے۔

ایک جگہ سیلاب آیا جس میں سارا علاقہ ڈوب گیا لیکن ایک ٹیلے پر پانی نہیں پہنچ سکا۔ انسان اور جنگل کے بہت جانور اور کیڑے مکوڑے اس ٹیلے پر پناہ لینے کے لئے جمع ہو گئے۔ ایک شیر تیرتا ہوا اس ٹیلے کی طرف آیا اور کتّے کی طرح ہانپتا ہوا لوگوں کے درمیان زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ اس قدر خوف زدہ تھا کہ اُسے گرد و پیش کا ہوش نہیں تھا۔ ایک آدمی اطمینان سے رائفل لے کر اس کی طرف بڑھا اور اس کے سر پر گولی مار دی۔ خوف کے جذبے سے شیر اپنی درندگی کی صفت کو بھی بھول گیا اور خوف کے جذبے نے اسے بکری سے بھی زیادہ بزدل بنا دیا۔

ہم جب زندگی میں کام کرنے والے جذبات کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ جذبات میں تبدیلی رُونما ہوتی ہے۔ گرد و پیش میں اگر خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی جائے تو لوگ خوف زدہ زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر گرد و پیش میں شجاعت اور بہادری کی فضا ہو تو لوگ بزدل شمار نہیں ہوتے۔ اسی طرح گرد و پیش میں اگر تساہل، کسل مندی، لاپرواہی کے عوامل کارفرما ہوں تو اس ماحول میں رہنے والے اکثر لوگ کاہل اور تساہل پسند ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ماحول میں سے کسل مندی اور تساہل دُور کر دیا جائے تو اسی مناسبت سے لوگ باعمل ہو جاتے ہیں اور قوتِ ارادی سے کام لے کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں۔

مثال ۔ ایک آرام طلب عورت ہے جو کسی قسم کی زحمت گوارا کرنا نہیں چاہتی۔ وہ صبح سویرے بستر سے نہیں اُٹھتی۔ دیر تک سونے کی عادی ہے۔ جہاں اس کو دقت یا پریشانی نظر آتی ہے، اُدھر کا رُخ نہیں کرتی۔ لیکن یہی عورت جب ماں بن جاتی ہے تو

اس کے اندر انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ ماں کا جذبہ غالب ہونے کے بعد وہ راتوں کو جاگتی ہے۔ بغیر کسی عذر اور شکایت کے بچے کی پرورش اور تربیت میں تکلیف کے خیال کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ اس کے برعکس بچے کی وجہ سے اس کو جو بے آرامی ہوتی ہے وہ اس کے اندر کچھ کرنے کے احساس کو اور گہرا کر دیتی ہے۔ وہ ذاتی طور پر کتنی ہی کنجوس، بے مروّت اور خود غرض ہو لیکن بچہ کے لئے وہ ہمیشہ ایثار کرتی ہے۔

جو لوگ خوف زدہ زندگی سے آزاد نہیں ہیں وہ خود غرضی اور ہر قسم کے نفسانی اور شہوانی جذبات کی یلغار میں گھرے رہتے ہیں۔ یہ سفلی جذبات ان کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔ خود پرستی اور شہوانی احساسات بالآخر ان کے اوپر جمود طاری کر دیتے ہیں اور جب وہ زندگی کے اس دور میں قدم رکھتے ہیں جہاں یہ جذبات جبلّی طور پر از خود سرد پڑ جاتے ہیں تو ان کے اوپر ایک ختم نہ ہونے والی بیزاری کی کیفیت مسلّط ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت سے نبرد آزما ہونے کے لئے وہ ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں جن طریقوں میں دوسرے لوگوں کے لئے اذیت اور تکلیف کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً وہ جب کسی دوسرے آدمی کو نیکی کی طرف راغب کرنے کی دعوت دیتے ہیں تو برملا کہتے ہیں تم نیکی نہیں کرتے یعنی وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم نیکوکار ہیں۔ کوئی بات سمجھنے، سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کو سمجھ نہ سکیں تو نفرت اور غصّے کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ان کے اندر اس طرزِ فکر کی چھاپ اتنی گہری ہو جاتی ہے کہ ان کے چہرے مسخ اور بے نور ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے چہرے کی اسکرین پر ایک کربناک فلم چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس کی طرزِ فکر میں خوف نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا اس سے جو اعمال و افعال سرزد ہوتے ہیں ان کے پیچھے جہنّم کا خوف نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کا

نصب العین مجازانہ رابطہ اور خالق کے سامنے خوشی سے سرِ تسلیم خم کرنا اور اپنے تئیں اس کے حوالے کر دینا ہوتا ہے۔ ان کے اندر سے ہر قسم کا خوف اور اندیشہ نکل جاتا ہے اور سعادت آمیز سکون ان کی طبیعت میں راسخ ہو جاتا ہے۔ وہ ہر دلعزیزی اور عزّت و اقتدار کی تمنا کو اپنے لئے ممنوع قرار دیتے ہیں۔ جھوٹ اور منافقانہ عمل سے پرہیز کرتے ہیں۔ اپنے قول و فعل سے کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کامل راستی برتتے ہیں۔ سچائی کو جس طرح دیکھتے ہیں اسی طرح بے دریغ بیان کر دیتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے وسوسوں، کمزوریوں اور خدشات کو قبول نہیں کرتے۔ سنجیدہ رہتے ہیں، سنجیدہ باتیں کرتے ہیں۔ اور اپنے آدم زاد بھائی اور بہنوں کو سنجیدہ طریقوں پر زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ جھوٹی عاجزی اور علم کی نمائش نہیں کرتے۔ بناوٹ اور غرور ان سے دور بھاگتا ہے۔

مرکزِ جذبات کی درستگی سے انسان کے اندر ایسی پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ روحانی ناسازیٔ طبیعت اور زندگی کی بے آہنگی سے پاک ہو جاتا ہے جسمانی شہوات اور بے ہودہ خیالات سے دل پاک ہوتا ہے۔ دنیا کی آلائشوں سے نجات مل جاتی ہے۔ ایسا بندہ اپنے بھائیوں بہنوں اور اللہ کی تمام مخلوق کے ساتھ محبت اور نرم دلی کا رویّہ اختیار کرتا ہے۔ دشمنوں سے بھی محبت کرتا ہے اور بظاہر نظر آنے والے گھناؤنے انسانوں کے ساتھ بھی لطف و کرم سے پیش آتا ہے۔ مرکزِ جذبات کی نادرستگی سے انسان سختی، ناہمواری، منافقت، کور چشمی، کبر و نخوت، حرص و طمع اور احساسِ برتری یا احساسِ کمتری کا ایک فعّال کردار بن جاتا ہے۔ ایسا کردار جس کو شیطان ذرّیتِ ابلیس میں شامل کر کے اس سے اپنے مشن کا کام لیتا ہے۔

●●●

مرشد اور مُرید

زندگی کے بے شمار رُخ ہیں اور زندگی کا ہر رُخ اپنے اندر کشش رکھتا ہے۔ شعوری زندگی میں رہتے ہوئے زندگی کے اس پار لاشعور میں آدمی جب جھانکتا ہے تو اس کے اوپر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ یہ ساری دنیا گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر گروہ کا اپنا ایک نظریہ ہے اور ہر گروہ اپنی مخصوص خواہشات کے تانے بانے میں خود اختیاری قیدی ہے۔ ایک جواری یہ جانتے کے باوجود کہ جُوا کھیلنا دولت کا ضیاع ہے، تنگ دستی میں بھی جُوا کھیلتا رہتا ہے ایک شرابی اس بات سے باخبر ہوتا ہے کہ شراب اس کے پھیپھڑوں کو گھُن بن کر چاٹ رہی ہے، پھر بھی شراب پینا نہیں چھوڑتا۔ شراب مصائب اور پریشانیوں سے نجات پانے کے لئے پی جاتی ہے، مگر یہ کیسی نجات ہے کہ یہی نجات آدمی کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔

مذہب کا پیروکار گروہ عقائد کی بھول بھلیوں میں سفر کرتا رہتا ہے۔ عقائد کی اس طوفانی دنیا میں بے شمار فرقے ہیں۔ ہر فرقہ خود کو ناجی اور دوسروں کو ناری سمجھتا ہے لیکن جب کسی بھی فرقے کے کسی بھی فرد کو اندر سے ٹٹولا جاتا ہے تو اس کے اندر بے یقینی اور شک کا لاوا اُبلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ستر سال کی عمر سے اسّی سال تک عبادت و ریاضت کرنے والے کسی شخص سے جب آسائش (جنّت) اور آلام (دوزخ) کی زندگی کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو وہ بے یقینی کی اس منزل میں ہوتا ہے جس منزل کو دوزخ کے علاوہ دوسرا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ مذہب انسان کو یقین کی دنیا کی ترغیب دیتا ہے۔ اور یقین کی تکمیل

اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک یقین مشاہدہ نہ بن جائے۔ مذہب افراط و تفریط، کبر و نخوت، احساس کمتری اور احساس برتری کے جذبات کی نفی کرتا ہے اور مذہبی انسان پر یہ جذبات مسلط رہتے ہیں۔ مذہب نوعِ انسانی کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے اور مذہبی دانشور اپنی پوری توانائی اس کی مخالف سمت میں صرف کر دیتا ہے۔

صوفیوں، پیروں اور سجادہ نشینوں کی دنیا عجیب طلسماتی دنیا ہے۔ زندگی کے بارے میں ان کے اپنے نظریات ہیں۔ اور اپنا ایک رُخ ہے۔ یہ گروہ کہتا ہے کہ مرشد کی اطاعت مرید پر لازم ہے۔ مرشد کے حکم کی تعمیل میں فرق اور امتیاز کرنا درست نہیں ہے کیونکہ مُرشد خدا کا نمائندہ ہے۔ مرشد کی اطاعت نہ ہونے سے رُوح کمزور ہو جاتی ہے۔ مرشد کے سامنے مرید موم کی گڑیا ہے تاکہ وہ جدھر چاہے اُسے موڑ دے۔ بولنا، لکھنا، پڑھنا، چپ رہنا، کوئی کام کرنا یا نہ کرنا سب مرشد کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ مرید کو مرشد کے ہاتھوں میں ایسا ہونا چاہیئے جیسے بوڑھے اور ضعیف آدمی کے ہاتھ میں لاٹھی۔ ایک بے جان مادّی چیز جس کو جہاں مرشد چاہے اُٹھا کر رکھ دے۔ کہا جاتا ہے کہ مرشد اگر مرید کو حکم دے کہ کنوآں میں کود جا۔ مرید تعمیل حکم میں کنوآں میں کود گیا، مگر اُسے یہ خیال آ گیا کہ مرشد خود ہی بچا لے گا تو یہ پیر صاحب کی نظر میں حکم کی تعمیل نہیں ہوئی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ یہ سب اسرار و رموز وہ لوگ بیان کرتے ہیں جن کی زندگی شک اور بے یقینی سے عبارت ہے۔

جب ہم زاہدانہ زندگی کو دیکھتے ہیں تو یہ باب کھلتا ہے کہ زاہدانہ زندگی دراصل جبلّت کے خلاف جہاد اور جبلّت کے منافی کردار ہے۔ یہ گروہ اس بات پر مُصر ہے، بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ اعلیٰ جذبات کے مقابلے میں ادنیٰ اور اسفل جذبات کو سوخت کر دیا جائے، خواہشات کو فنا کر دیا جائے، لباس ایسا زیبِ تن کیا جائے جو موٹا، کھردرا، بھدّا اور بدصورت

ہو۔ غذا ایسی کھائی جائے جو روکھی سوکھی ہو۔ زندگی کے شب و روز میں قنوطیت کا عمل دخل ہو۔ آدم کو بے نوا انسان بن کر زندہ رہنا چاہیئے۔ ظاہر ہے بے نوا انسان فقر و فاقے ہی میں زندگی بسر کرے گا۔ اور بھوک پیاس، گرمی و سردی کی مصیبت اور تکلیف اس کا سرمایۂ حیات بن جائے گا۔ خود ساختہ پُرمشقت زندگی کو وہ تسلیم و رضا کا نام دیتا ہے۔

قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں مذہب یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایمان ہو۔ ایمان یؤمنون بالغیب ہے۔ ایمان یقین ہے اور مشاہدے کے بغیر یقین کی تکمیل نہیں ہوتی۔ یقین کی دنیا میں داخل ہو کر انسان یہ جان لیتا ہے کہ ساری انسانی برادری کا حاکم اعلیٰ اللہ ہے اللہ چاہتا ہے کہ انسان متحد اور مضبوط ہو کر اس کی رسی کو تھامے رہیں۔ اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالیں۔ حاکم اعلیٰ اللہ کو جاننے اور پہچاننے والے اس کے دوست ہیں۔ اور دوست اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ دوست دوست کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ اس لئے اس کے باطن میں یہ بات راسخ ہوتی ہے کہ وہ جنتی ہے۔

قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں مُرید اور مُرشد کا رشتہ استاد شاگرد، اولاد اور باپ کا ہے۔ مُرید مُرشد کا محبوب ہوتا ہے۔ مُرشد مُرید کی افتادِ طبیعت کے مطابق تربیت دیتا ہے۔ اس کی چھوٹی بڑی غلطیوں پر پردہ ڈالتا ہے نشیب و فراز اور سفر کی صعوبتوں سے گزار کر اُسے اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں پرسکون زندگی اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔

قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں زاہدانہ زندگی یہ نہیں ہے کہ آدمی خواہشات کو فنا کر کے خود فنا ہو جائے۔ آدمی اچھا لباس پہننا ترک کر دے۔ پھٹا پرانا اور پیوند لگا لباس پہننا ہی زندگی کا اعلیٰ معیار قرار دے لے تو دنیا کے سارے کارخانے اور تمام چھوٹی بڑی فیکٹریاں بند ہو جائیں گی۔ اور لاکھوں کروڑوں لوگ بھوک زدہ ہو کر ہڈیوں کا پنجر بن جائیں گے۔

اللہ نے زمین کی کوکھ سے وسائل اس لئے نہیں نکالے کہ ان کی بے قدری کی جائے۔ ان کو استعمال نہ کیا جائے۔ اگر روکھا سوکھا کھانا ہی زندگی کی معراج ہے تو بارشوں کی ضرورت نہیں باقی رہے گی۔ زمین بنجر بن جائے گی۔ زمین کی زیبائش کے لئے اللہ نے رنگ رنگ کے پھولوں، پتوں، درختوں، پھلوں، کوہساروں اور آبشاروں کو بنایا ہے

قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں:

زاہد کو چاہیئے کہ اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت کو خوش ہو کر استعمال کرے لیکن خود کو اس کا مالک نہ سمجھے۔ اللہ روکھی سوکھی دے تو اسے بھی خوش ہو کر کھائے اور اللہ مُرغ پلاؤ دے تو اُسے بھی خوش ہو کر کھائے۔ جب سب کچھ ہے تو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ در و بست میں اللہ کو اپنا کفیل سمجھے اور ہر حال میں اللہ کا شکر گزار بندہ بنا رہے۔

●●●

راکھ کا ڈھیر

خالق کائنات نے کہا: "میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں۔"

اللہ تعالےٰ کے حضور فرشتوں نے دست بستہ اپنی رائے کا اظہار یوں کیا: "یہ بندہ بشر زمین پر خون خرابے کی علامت بن جائے گا۔"

اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کی بات سن کر یہ نہیں فرمایا کہ یہ بندہ زمین پر فساد نہیں پھیلائے گا۔ ارشاد ہوا: "میں جو جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔" اور آدم کو اپنی صفات کا علم سکھا دیا اور اپنے اس شاہکار کو پیش کر کے فرشتوں سے کہا: "بیان کرو تم اس کے مقابلے میں کتنا علم رکھتے ہو۔"

فرشتے عظمت و جلال سے لرز کر پکار اٹھے "ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا علم ہمیں آپ نے سکھا دیا ہے، بے شک آپ علیم و حکیم ہیں۔"

فرشتوں کے مطابق آدم فسادی اور فتنہ انگیز ہے لیکن اگر اُسے علم الاسماء حاصل ہے تو وہ اللہ کا نائب ہے۔ بالفاظ دیگر اگر آدم زاد اللہ کا نائب نہیں ہے تو یہ جیتا جاگتا شر و فساد ہے۔ شر اور فساد کا قدرتی نتیجہ اللہ سے دوری ہے اور اللہ سے دوری بندہ کو خوف اور ملال میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خوف زدہ انسان ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں خود کو زیادہ باشعور، زیادہ عقل مند اور زیادہ طاقتور ثابت کرے۔ دو ہزار سال کے طویل عرصے میں خوف کا یہ جذبہ بتدریج بڑھتے بڑھتے ایک ایسا

پہاڑ بن گیا ہے کہ اس کی وسعت کے سامنے زمین کی اپنی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ خوف سے نجات پانے کے لئے قوموں نے خود اپنی نوع کو برباد کرنے کے لئے ایسی ایسی اختراعات کیں کہ اُن سے زمین کا کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ اور پھر اس زبوں کاری کا نام ترقی رکھ کر ساری انسانی آبادی کو اضطراب اور بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ آدمی نے خود کو برتر ثابت کرنے کے لئے ایسے ایسے ہتھیار تیار کئے کہ دنیا چشم زدن میں بھک سے اُڑ جائے گی۔ نوع انسانی کے ان دانشوروں نے جو بلاشبہ اللہ کے نائب نہیں ہیں نت نئے مہلک ہتھیاروں کی ایجاد سے اپنی پیشانیوں کو داغ دار بنا دیا ہے۔ ترقی یافتہ قوم کے باشعور افراد کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت دنیا میں چالیس ہزار ایٹم بم موجود ہیں۔ دیگر روایتی اسلحہ کا تو کوئی شمار و قطار ہی نہیں۔ یہ ترقی کس لئے ہو رہی ہے، کس کے خلاف یہ ہتھیار بنائے جا رہے ہیں۔ ان خوفناک ہتھیاروں کے استعمال سے کون تباہ ہوگا؟ کیا یہ خود اپنے گھر کو آگ لگانے کے مترادف نہیں ہے؟

زمین اللہ کی ملکیت ہے، زمین انسان کی فلاح و بہبود کا ایک گہوارہ ہے زمین ہماری جنم بھومی ہے۔ زمین وہ ہے جس کی کوکھ سے ہمارے لئے قدرت وسائل پیدا کرتی ہے۔ یہ زمین ہی ہے جس کے اوپر لہلہاتے باغ ہمارے لئے اللہ کی نعمتوں کے دسترخوان بن گئے ہیں۔ ہائے افسوس! جس کوکھ میں ہم پرورش پا کر جوان ہوئے ہیں، ہم ترقی کے نام پر اسی کوکھ کو اجاڑ دینا چاہتے ہیں! یہ کیسی ترقی ہے کہ جس سے رنگ رنگ مناظر، سرو سمن، کوہ و دمن، لالہ و صحرا راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے! یہ ترقی نہیں، تنزل ہے، ابتلا ہے، خوف ہے۔ اس بات کا خوف کہ ہماری ہی برادری ہمیں تباہ کر دے گی اور اس تباہی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی کوئی طاقت ہمارے پاس ہو کہ برادری کا دوسرا گروہ

ہمیں تباہ نہ کر سکے لیکن اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جب کوئی چیز وجود میں آجاتی ہے تو اس کا استعمال لازمی ہو جاتا ہے۔ یہ جو چالیس ہزار ایٹم بم اور نہیں معلوم کون کون سے بم وجود میں آچکے ہیں ایک روز ضرور پھٹیں گے اور دُنیا ترقی کے جگمگاتے دھوکے سے آزاد ہو گی تو زمین پر نہ شجر ہو گا، نہ حجر ہو گا اور نہ ہی خوف زدہ انسانوں کی ترقی کا کوئی ثمر ہو گا۔

خوف زدہ زندگی سے باہر آجایئے، پھر یہ بربادی کا سامان مہیا کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی اور زمین کی آغوش بھی ویران نہیں ہو گی جس کا ایک ایک ذرّہ ہمارے لئے حیات ہے۔

●●●

اڑن کھٹولے

زندگی اور زندگی سے متعلق جذبات و احساسات، واردات و کیفیات، تصوّرات و خیالات اور زندگی سے متعلق تمام دلچسپیاں اس وقت تک قائم ہیں جب تک سانس کی آمد و رفت جاری ہے۔ زندگی کا دار و مدار سانس کے اوپر قائم ہے۔ سانس کی طرز دل پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر ذی رُوح میں سانس کا نظام قائم و دائم ہے لیکن ہر نوع میں سانس کے وقفے متعین ہیں مثلاً یہ کہ اگر آدمی کے اندر سانس کے ذریعے دل کی حرکت متعینہ وقت میں ۷۲ ہے تو بکری میں اس سے مختلف ہو گی۔ چیونٹی میں اس سے بالکل مختلف ہو گی۔

کوئی ایسا آلہ ایجاد کر لیا جائے کہ جس سے درخت کے سانس کی پیمائش ہو سکے تو اس کے سانس کی دھڑکن بولنے والی مخلوق سے مختلف ہو گی اور اگر ہم کوئی ایسا آلہ ایجاد کر لیں جس سے پہاڑ کی نبض کی حرکت ریکارڈ کریں تو وہ درخت کے اندر کام کرنے والی نبض کی حرکت سے مختلف ہو گی۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ایک سانس آتا ہے، ایک سانس جاتا ہے یعنی ایک سانس ہم اندر لیتے ہیں اور ایک سانس باہر نکالتے ہیں۔ یہ بات بھی ہم سب کے سامنے ہے کہ پُرسکون حالت میں سانس میں ایک خاص قسم کا توازن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس پریشانی، غم یا اضطراب میں سانس کی کیفیت مختلف ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی آدمی ڈر جائے تو اس کے دل کی حرکت تیز اور بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اگر غور کریں تو نظر آئے گا کہ دل

کی حرکت کے ساتھ سانس کی حرکت بھی تیز ہو جاتی ہے۔ سانس کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ یہ ہے کہ ہم سانس اندر لیتے ہیں یعنی سانس کے ذریعے آکسیجن جذب کرتے ہیں اور دوسرا رُخ یہ ہے کہ ہم سانس باہر نکالتے ہیں یعنی کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔

یہاں پر بہت غور طلب نکتہ یہ ہے کہ جب ہم سانس لیتے ہیں تو کوئی چیز اندر جا کر جلتی ہے یعنی فضا میں جو آکسیجن پھیلی ہوئی ہے وہ سانس کے ذریعے اندر جا کر جلتی ہے۔ جس گاڑی کے اندر پیٹرول جلتا ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جلا ہوا فضلہ باہر نکل جاتا ہے۔ یہ سلسلہ پیدائش سے موت تک برقرار رہتا ہے۔ اب ہم اس کو روحانیت کی طرز پر بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ ہم جب اندر سانس لیتے ہیں تو ہمارا رُخ باطن (INNER) کی طرف ہوتا ہے۔ ہم جب سانس باہر نکالتے ہیں تو ہماری تمام دلچسپیاں دنیا، دنیا میں پھیلی ہوئی چیزوں اور اپنے گوشت پوست کے حواس کے ساتھ قائم رہتی ہیں۔ حواس کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ وہ ہے جو ہمیں زمان و مکان (TIME AND SPACE) میں قید کرتا ہے۔ دوسرا رُخ وہ ہے جو ہمیں زمان و مکان سے آزاد کرتا ہے۔ نیند کی حالت میں ہمارے اوپر غالب رہتا ہے یعنی جب ہم سو جاتے ہیں تو ہمارے شعوری حواس کی نفی ہو جاتی ہے اور ہمارے اوپر سے زمان و مکان (TIME AND SPACE) کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور جب ہم بیدار ہو جاتے ہیں تو (TIME AND SPACE) سے آزاد حواس عارضی طور پر ہم سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق خواب اور بیداری زندگی کے دو رُخ ہیں یعنی انسان کی زندگی،

دو رُخ یا دو حواس سے مرکب ہے۔ ایک کا نام دن یا بیداری ہے اور دوسرے کا نام خواب یا رات ہے۔ رات کے حواس میں ہر ذی رُوح مخلوق TIME AND SPACE سے آزاد ہو جاتی ہے، دن کے حواس میں ہر ذی رُوح مخلوق TIME AND SPACE کے حواس میں قید ہو جاتی ہے۔ زندگی کا قیام سانس کے اُوپر ہے اور سانس کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ یہ کہ سانس ہم اندر لیتے ہیں اور دوسرا رُخ یہ کہ ہم سانس باہر نکالتے ہیں۔ سانس کا اندر جانا ہمیں ہماری رُوح سے قریب کر دیتا ہے اور سانس کا باہر آنا ہمیں اس حواس سے قریب کرتا ہے جو حواس ہمیں رُوح کی معرفت سے دُور کرتے ہیں۔ جب ہم آنکھیں بند کر کے یا کھلی آنکھوں سے کسی طرف پوری یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں تو سانس اندر لینے کا وقفہ زیادہ ہو جاتا ہے یعنی ہماری شعوری توجہ رُوح کی طرف ہو جاتی ہے۔

تصوّف کے اوپر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں روحانی علوم کا تذکرہ تو کیا گیا ہے لیکن اس علم کو ایک اور ایک دو، دو اور دو چار کی طرح عام نہیں کیا گیا۔ بہت سے رموز و نکات بیان کئے گئے پھر بھی رموز و نکات پردے میں اس لئے ہیں کہ ان رموز و نکات کو وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جو منزل رسیدہ ہیں۔ یا جو حضرات راہِ سلوک میں سفر کر چکے ہیں۔

ہمارے اسلاف نے یہ بھی فرمایا کہ روحانی علوم چونکہ منتقل ہوتے ہیں اس لئے ان کو محفوظ رہنا چاہیئے اور ان کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علوم کا نام علم سینہ رکھ دیا گیا۔ اسلاف نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ روحانی علوم حاصل ہونے کے بعد ان کے نتائج (مافوق الفطرت باتوں) کو چھپا لینا چاہیئے۔ ایسا کیوں ہوا! ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں کے اندر سوچنے سمجھنے اور علم حاصل کرنے کی صلاحیت اتنی نہیں تھی جتنی صلاحیت آج موجود ہے۔ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور سے پہلے دور دراز آوازوں کا

پہنچنا کرامت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج سائنس دانوں نے آواز کا طول موج (WAVE LENGTH) دریافت کرلیا ہے۔ خیالات کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا بھی کرامت (مافوق الفطرت) بیان کیا جاتا تھا۔

آج کی دنیا میں ہزاروں میل کے فاصلے پر پوری کی پوری تصویر منتقل ہوجاتی ہے زیادہ عرصہ نہیں صرف پچاس سال پہلے لوگوں سے یہ کہا جاتا تھا کہ آدمی روشنیوں کا بنا ہوا ہے تو لوگ مذاق اڑاتے تھے۔ آج سائنس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ آدمی لہروں سے مرکب ہے۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے یہ بات بتادی کہ آدمی لہروں سے مرکب ہے، وہ آدمی کی ایک جگہ سے گزرنے کے بعد بھی تصویر لے لیتے ہیں۔

پہلے زمانے میں دادی اور نانی بچوں کو کہانی میں اڑن کھٹولوں کے قصے سنایا کرتی تھیں کہ ایک اڑن کھٹولا تھا۔ اس پر ایک شہزادی اور شہزادہ بیٹھے اور اڑ گئے۔ دادی اور نانی کے وہی اڑن کھٹولے آج ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ نہ صرف یہ کہ موجود ہیں بلکہ ہم اس میں بیٹھ کر اپنی مرضی اور منشا کے مطابق سفر بھی کرتے ہیں۔

ان تمام مثالوں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ سائنس کی ترقی سے پہلے نوع انسانی کی صلاحیت اتنی نہیں تھی کہ روحانی رموز و نکات اس کی سمجھ میں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بزرگوں اور اسلاف نے پہلے چند لوگوں کا انتخاب کیا اور پھر ان کو وہ علوم منتقل کردیئے۔ لیکن آج کے دور میں انسان کی دماغی صلاحیت اور سکت، فہم اور تفکر اتنا زیادہ طاقتور ہے کہ جو چیزیں پہلے کشف و کرامات کے دائرے میں آتی تھیں آج وہی چیزیں انسان کی عام زندگی میں داخل ہیں۔ جیسے جیسے علوم سے انسان کی سکت بڑھتی گئی، شعور طاقتور ہوگیا۔ ذہانت میں اضافہ ہوا۔ گہری باتوں کو سمجھنے اور جاننے کی سکت بڑھی۔

سائنس کی ترقی سے یہ بہت بڑا فائدہ ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے شعور کی طاقت بڑھی اسی مناسبت سے آدمی کے اندر یقین کی طاقت کمزور ہوتی چلی گئی۔

یقین کی طاقت کمزور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ سے دور ہوگیا اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سائنس کی ترقی کا مطمح نظر زیادہ تر دنیاوی آرام و آسائش کا حصول ہے۔ چونکہ دنیا خود بے یقینی کا سمبل (SYMBOL) اور فکشن (FICTION) ہے اور مفروضہ حواس کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لئے یہ ترقی بھی ہمارے لئے عذاب بن گئی۔ اگر اس ترقی کی بنیاد ظاہر اسباب کے ساتھ ماورائی صلاحیت کی تلاش ہوتی تو یقین کمزور ہونے کے بجائے طاقتور ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود سائنسی علوم کے پھیلاؤ سے بہرحال اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ ہمارے اندر ایسے علوم حاصل کرنے کی صلاحیت کا ذوق پیدا ہوا جو ہمیں روحانیت سے قریب کرتے ہیں۔

اب سے پچاس سال پہلے یا سو سال پہلے جو چیز پچاس پچاس، سو سو سال کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتی تھی اب وہی چیز ارادے کے اندر یقین مستحکم ہونے سے چند مہینوں اور چند سالوں میں حاصل ہوجاتی ہے۔

ختم شد